درندہ

طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

یہ کوئی مافوق الفطرت کہانی نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں بہت جنگ و جدل ہے۔ اس میں درندگی ہے لیکن یہ کسی اور رنگ کی ہے اور یہ رنگ ایسا ہے جو پہلی سطر سے لے کر آخری تک آپ کو کہانی سے جڑے رہنے پر مجبور کر دے گا۔ یہ میری پسندیدہ ترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ کبھی فرصت ملی اور اللہ نے ہمت دی تو اس کی ڈرامائی تشکیل کی کوشش کروں گا۔ انشاءاللہ۔

کہانی میں اسرار اور تجسس کا ایک ایسا پیچ ہے جو آپ کو ایک صفحے سے اگلے صفحے تک جانے پر مجبور کرتا رہے گا۔ اسرار اور تحیر کے باوجود یہ کہانی حقیقت سے قریب تر ہے۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں جو افسانوی رنگ کا ہو۔ جو کچھ ہے سچ ہے اور ہماری اردگرد کی زندگی سے ہے۔

یہ کہانی آپ کو شہری معاشرے سے دور دیہاتی معاشرے کے ان ڈھکے چھپے گوشوں میں لے جائے گی جن کے متعلق آپ نے سنا ہوگا، دیکھا کبھی نہیں ہوگا۔ جہاں اب بھی جنوں بھوتوں، بڈاووں، پچھل پیریوں کا خوف لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا ہے، جہاں اب بھی زندہ پیروں اور خانقاہوں کی حکومت ہے۔

یہ کہانی بتائے گی کہ انسان ترقی یافتہ مغرب سے تعلق رکھتا ہو یا ایشیا کے کسی پسماندہ دیہات سے، اس کی فطرت میں نیکی اور بدی کا ازلی جذبہ موجود ہے۔ اس کہانی میں آپ کو خوف و دہشت کی فضا میں محبت جیسے نازک جذبے کی ایک ننھی سی کونپل پھوٹتی نظر آئے گی اور یہ حقیقت بھی ملے گی کہ محبت کا لافانی جذبہ رنگ، نسل، مذہب یا

زبان کا محتاج نہیں ہوتا۔

قدرت اپنے ہونے کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار پُراسرار ہونے کے باوجود قدرت کی صناعی کا ثبوت ہے۔ اس کی ہستی ناقابلِ یقین ہے لیکن اس کے سینے میں دل دھڑکتا ہے اور اس دل میں وہ سارے جذبات موجود ہیں جو کسی انسان میں ہو سکتے ہیں۔ انہیں جذبوں میں وہ جذبہ موجود ہے جو جذبوں کا بادشاہ ہے۔ آپ پڑھیں اور دیکھیں کہ وہ کون سا جذبہ ہے۔

والسلام

طاہر جاوید مغل

میرا نام محمد اسلم باجوہ ہے۔ عمر اسّی برس سے تھوڑی زیادہ ہی ہوگی۔ تاہم صحت کے اعتبار سے میں پینسٹھ ستر کے قریب نظر آتا ہوں۔ بہتر ہے کہ اپنی زندگی کا یہ یادگار اور ناقابل فراموش واقعہ بیان کرنے سے پہلے میں اپنا تھوڑا سا تعارف مزید کرا دوں۔ میں پیشے کے لحاظ سے صحافی ہوں۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد میں جالندھر سے لاہور چلا آیا۔ میری فیملی بھی میرے ساتھ تھی۔ ایک بہن ثریا جو مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی، مجھے اتنا چاہتی تھی کہ اس کی چاہت کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ والد صاحب مذہبی آدمی تھے انہوں نے اپنی اچھی صفات ہم دو بھائیوں میں منتقل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ خاص طور سے مجھ پر توجہ دی گئی تھی کیونکہ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ والد صاحب سرکاری ملازم تھے۔ سرکاری ملازم خوفِ خدا بھی رکھتا ہو تو پھر وہ اپنی کمائی سے بچوں کا پیٹ تو پال سکتا ہے لیکن گھر میں پیسوں کی ریل پیل کا ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں بھی خدا کا شکر تھا لیکن پیسا اتنا ہی تھا جس سے بہ مشکل ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ والد صاحب کی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کو جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی مضبوط بنائیں۔ جسمانی صحت کے لیے وہ اپنے ہاتھ سے ہم دونوں بھائیوں کے جسموں پر تیل کی مالش کرتے تھے اور اسکول بھیجنے سے پہلے ہمیں ورزش کراتے اور کشتیاں لڑاتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں شروع سے ہی چست اور توانا تھے۔ اپنے ہم جولیوں میں ہمارے قد کاٹھ بھی نمایاں تھے۔ ٹائیلوں کے پختہ فرش پر کشتی لڑنے سے ہم دونوں بھائیوں کی کہنیاں اور گھٹنے وغیرہ چھل جاتے تھے۔ والدہ ہماری ان خراشوں اور زخموں سے پریشان ہوتی تھیں لیکن والد صاحب کے کسی بھی کام میں مداخلت کرنا ان کی ہمت اور طاقت سے باہر تھا۔ ان کا یہ رویہ ہماری جوانی تک جوں

کا توں رہا۔ جن دنوں کا یہ ذکر ہے گریجویٹ شخص کو عالم فاضل تصور کیا جاتا تھا اور بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تعلیم کے معیار کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ والد صاحب نے صرف میٹرک کیا تھا لیکن انگریزی روانی سے لکھ اور بول لیتے تھے۔ میں نے گریجویشن کرنے کے بعد چند ماہ حسبِ روایت نوکری کے لیے دھکے کھائے پھر خوش قسمتی سے ایک معروف انگریزی اخبار میں مجھے پروف ریڈر کی ملازمت مل گئی۔ معاوضہ ناقابلِ بیان حد تک کم تھا۔ بہرحال کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر تھا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں کہ آگے بڑھنے کے امکانات بھی تھے۔ صحافت اور تصنیف و تالیف کی طرف میرا فطری میلان تھا۔

میں نے مذکورہ اخبار میں دو سال تک جم کر کام کیا اور سب ایڈیٹر کی منزل تک پہنچ گیا۔ اسی دوران میں میرے ایک چچا نے میرے چھوٹے بھائی انور کو اپنے پاس انگلینڈ میں بلوا لیا۔ ایک دو ماہ میں ہی انور وہاں سے پیسے بھیجنے لگا۔ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ والد صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد گارمنٹس کی دکان کر لی تھی۔ وہ ایسا نہ بھی کرتے تو گھر کا خرچہ اب بڑے اچھے طریقے سے چل رہا تھا لیکن جس شخص نے ساری زندگی کام کیا ہو اس کے لیے فارغ بیٹھنا کڑی مشقت سے زیادہ دقت طلب ہوتا ہے۔

میری عمر اب چوبیس برس کے قریب تھی۔ جسم مضبوط تھا، کہنے والے کہتے تھے کہ میں قبول صورت ہوں۔ بہن ثریا مجھے خوش خطی کے نمبر بھی دیتی تھی۔ ابھی تک میں غیر شادی شدہ تھا۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب کوئی انجانا چہرہ آپ ہی آپ آنکھوں میں آ بستا ہے کوئی ان سنی راگنی خود بہ خود کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے...... اور دل بے وجہ کسی کی تلاش کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ مجھ پر بھی اکثر و بیشتر یہ کیفیت طاری ہوتی تھی لیکن اس کیفیت کا دورانیہ میری مصروفیت کی وجہ سے بہت کم ہوتا تھا۔

اب میں اس حیرت انگیز واقعے کی طرف آتا ہوں جو ان اوراق کی وساطت سے آپ کو سنانا چاہ رہا ہوں۔ اب عمر کے اس حصے میں ہوں جب سب کچھ کہہ دینے کو دل چاہتا ہے اور یہ واقعہ تو ایسا ہے جو پچھلے چالیس پچاس سال میں شاید چند لمحوں کے لیے بھی میرے ذہن سے جدا نہیں ہوا ہے۔ بہ ظاہر ذہن سے جدا ہوتے ہوئے بھی یہ لاشعور سے

چمٹا رہا ہے۔ ذہن میں موجود لاتعداد تلخ و شیریں واقعات کے درمیان اس واقعے کی وہی حیثیت رہی ہے جو چاند تاروں میں سورج کی ہوتی ہے۔ آج سے تقریباً تیس برس قبل میں نے اخبار کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اس وقت میں ایک انگریزی ہفت روزے کا چیف ایڈیٹر تھا۔ اس فراغت کے بعد میں نے اپنے طور پر اور اپنی مرضی سے تصنیف و تالیف کا ہلکا پھلکا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ ان دنوں میں نے اپنی زندگی کے اس سنسنی خیز واقعے کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی تھی۔ فل اسکیپ کے تقریباً 70 اوراق میں نے لکھے تھے۔ اس میں، میں نے کچھ نام اور مقامات تبدیل کر دیئے تھے۔ یہ ایک اثر انگیز کہانی تھی لیکن اس میں کئی گوشے تاریکی میں رہ گئے تھے۔ ایک دو اہم واقعات شامل نہیں ہو پائے تھے۔ کہانی پڑھتے ہوئے ایک ادھورا سا پن محسوس ہوتا تھا میں نے فیصلہ کیا کہ اس کہانی کو دوبارہ لکھوں گا اور پوری تفصیل سے لکھوں گا۔

میرا خیال ہے کہ تمہید طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اب مجھے اصل کہانی کی طرف آ جانا چاہیے لیکن اصل کہانی سے پہلے ایک چھوٹی سی تمہید اور...... میں عمر کے آخری حصے میں ہوں۔ میں نے اپنی ساری عمر ایک حقیقت پسند، روشن خیال شخص کی حیثیت سے گزاری ہے۔ ہم جالندھر سے آ کر لاہور میں آباد ہوئے تھے تاہم ہمارے کئی رشتے دار شرقپور کے نواحی دیہات میں آباد تھے۔ دیہات سے میرا اور میرے گھر والوں کا تعلق اٹوٹ تھا اور اب بھی ہے۔ دیہاتی زندگی کا رنگ ڈھنگ میں نے بہت سے قریب دیکھا ہے اور اس خوبصورت زندگی کو میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کوئی بھی ''پکا پینڈو'' جان سکتا ہے۔ دیہاتی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں، ان میں سے ایک پہلو کا ذکر میں یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ اس پہلو کا تعلق دیہی نفسیات سے ہے اور اس اسراریت سے ہے جو دیہی زندگی میں ہمیشہ لہریں لیتی رہتی ہے۔ دیہی علاقوں میں لوگ مافوق الفطرت چیزوں پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ ایسی باتیں عام سننے میں آتی ہیں، فلاں لڑکی پر سایہ ہو گیا، فلاں شخص پر کسی نے تعویذ ڈال دیے، کبھی کسی پرانے قبرستان میں ہوائی چیزوں کے بارے میں افواہ اُڑتی ہے، کبھی پتا چلتا ہے کہ فلاں کونے میں جنات کا بسیرا ہے۔ بعض لوگوں کو چھوٹے قد کے بھتنے (بڑاوے) بھی دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ میرے تجربے کے مطابق ہمارے ہر دوسرے

تیسرے گاؤں میں کوئی ٹیلا، کوئی کھنڈر یا درختوں کا جھنڈ ایسا ضرور ہوتا ہے جس کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ کہانیاں سینہ گزٹ کی شکل میں نسل در نسل سفر کرتی ہیں۔ دیہات میں سبھی لوگ تو اَن پڑھ اور سادہ لوح نہیں ہوتے لیکن سچ کہتے ہیں کہ نمک کی کان میں ہر شے نمک ہو جاتی ہے۔ میں نے دیہی ماحول میں پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں کو بھی حیرت انگیز توہمات کا شکار دیکھا ہے۔ ان توہمات کا ذکر یہاں کروں گا تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

یہ نومبر، دسمبر کے دن تھے۔ ان دنوں میں لاہور کے ایک انگریزی اخبار میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دینا شروع کر چکا تھا۔ تقریباً دوڈھائی سال سے میری چھٹیاں جمع ہو رہی تھیں اور میں انہیں گزارنے کے لیے کسی اچھے موقع کا منتظر تھا۔ غالباً وہ شروع دسمبر کی ایک کہر آلود صبح تھی جب مجھے یہ موقع مل گیا۔ مجھے اپنے دوست شوکت گوندل کی طرف سے ایک رجسٹرڈ خط موصول ہوا۔ شوکت نے لکھا تھا کہ اس کا تبادلہ پھر سے باغ پور گاؤں میں ہو گیا ہے۔ رہائش بھی اچھی ملی ہے اگر میں دو چار ہفتوں کے لیے آنا چاہوں تو بڑا اچھا موقع ہے۔ مرغابی کا شکار زوروں پر ہے۔ سؤر کشی بھی ہو رہی ہے۔

شوکت گوندل پولیس میں انسپکٹر تھا۔ جالندھر میں ہم دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے اور اچھے دوست تھے۔ ان دنوں پولیس میں پڑھے لکھے افراد بہت کم آتے تھے۔ تاہم شوکت کو خاندانی پس منظر کی وجہ سے پولیس میں نوکری مل گئی تھی۔ پچھلے تین چار سال میں وہ انسپکٹر کے عہدے تک پہنچ گیا تھا، یعنی پکا تھانے دار بن گیا تھا، بہرحال ہماری دوستی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ شوکت پچھلے برسوں میں زیادہ تر دیہی تھانوں میں تعینات رہا تھا۔ ان میں سے ایک تھانا ''باغ پور'' کا بھی تھا۔ یہ خالص دیہاتی علاقہ شوکت کو بہت پسند آیا تھا۔ کوئی ڈیڑھ برس پہلے جب وہ باغ پور میں تھا تو اس نے مجھے وہاں بلایا تھا۔ ہم نے چار پانچ دن وہاں ایک ساتھ گزارے تھے اور خوب انجوائے کیا تھا۔ اب شوکت ایک بار پھر باغ پور میں تھا۔ شکار کا موسم بھی تھا، لہٰذا اس نے بہ ذریعہ خط مجھے فوراً آنے کی دعوت دے دی تھی۔

دیہی علاقوں سے مجھے بھی بہت محبت تھی، اوپر سے شکار کا موسم، میں فوراً تیار ہو گیا۔

دو چار روز میں ضروری کام نبٹانے کے بعد میں نے اپنے ایک ساتھی سب ایڈیٹر کو اپنی کرسی سونپی اور ایک ماہ کی چھٹی گزارنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

کوٹ سلطان سے مشرق کی طرف تقریباً چودہ میل تک پکی سڑک پر سفر کرنے کے بعد میں بس سے اترا اور نہر کے پُل پر پہنچ گیا یہاں سے آگے کچا راستہ تھا اور دیہاتی تانگے کا ہچکولے دار سفر تھا۔ چھ سات میل کے سفر کے بعد ہم ایک ڈیک نالے پر پہنچے۔ ڈیک نالے کو پار کرنے کے بعد مجھے ایک جیپ نظر آئی۔ اس خستہ حال جیپ میں شوکت کا اے ایس آئی محمد نذیر موجود تھا۔ وہ مجھے باغ پور لے جانے کے لیے آیا تھا۔ اس جیپ کے ذریعے ہم نے نو دس میل کا سفر مزید طے کیا۔ دشوار راستے کے اس کٹھن مگر دلچسپ سفر کے بعد ہم شام سے تھوڑی دیر پہلے باغ پور پہنچے۔

اس مرتبہ شوکت کو واقعی اچھی رہائش گاہ ملی تھی۔ باغ پور کے بیچوں بیچ یہ چار کمرے کا مکان موجود تھا۔ برآمدہ اور کشادہ صحن بھی تھا۔ یہ دیہاتی طرز کا کچا مکان تھا تاہم اس کی چار دیواری عام دیہاتی مکانوں کے برعکس اونچی تھی۔ شوکت نے پُرجوش طریقے سے میرا استقبال کیا۔ میرے لیے اس نے پانی گرم کرا رکھا تھا۔ نہانے اور مزیدار کھانا کھانے کے بعد ہم نے سگریٹ سلگائے اور لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر باتوں کے ''بند'' کھول دیے۔

اگلے تین چار دن خوب مزے میں گزرے۔ ہم باغ پور میں گھومتے پھرتے رہے۔ چند مرغابیوں کا شکار بھی کیا۔ خوشگوار اتفاق یہ تھا کہ شوکت بھی تقریباً فارغ ہی تھا، کوئی سنگین نوعیت کا کیس اس کے تھانے میں موجود نہیں تھا۔ باغ پور کی حیثیت ایک بڑے گاؤں یا چھوٹے قصبے کی تھی۔ اردگرد کے دس پندرہ مزید دیہات اس تھانے کے دائرہ کار میں آتے تھے۔ کافی آبادی بن جاتی تھی۔ اس کے باوجود اگر سنگین نوعیت کا معاملہ شوکت کے لیے موجود نہیں تھا تو یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی۔

شوکت کے مالک مکان کا نام نوازش چاند تھا۔ اسے صرف چاند کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ نام سے قطع نظر وہ کسی طرح بھی چاند نہیں تھا۔ رنگ سانولا، نقوش موٹے، سر نیم گنجا تھا لیکن کہتے ہیں کہ ہر شخص کسی نہ کسی کے لیے چاند ضرور ہوتا ہے۔ نوازش اس لحاظ

سے اگر چاند تھا بھی تو پھر اسے پوری راتوں کا چاند کہنا چاہیے کیونکہ وہ بہت موٹا تھا۔ توند نکلی ہوئی تھی، جھوم جھوم کر چلتا تھا۔ بہر حال اکثر موٹے افراد کی طرح وہ ایک ہنس مکھ شخص تھا۔ اس کی موجودگی میں کسی کے لیے بور ہونا ''ناممکن'' تھا۔ نوازش چاند میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ شوکت کا صرف ''مالک مکان'' ہی نہیں تھا اس کا ہوشیار مخبر بھی تھا۔ چاند کی عمر پینتیس چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔

باغ پور میں میرے قیام کا پانچواں روز تھا۔ رات کے دس بجے تھے۔ شوکت ابھی تک تھانے میں ہی تھا۔ وہ لڑائی جھگڑے کے ایک معاملے کو نبٹانے کے بعد ابھی فارغ ہوا تھا۔ میں بھی اس کے پاس بیٹھا تھا۔ ہم نے مٹی کی انگیٹھی سلگا رکھی تھی اور مونگ پھلی ٹھکور رہے تھے۔ ایک دن کے بعد اتوار تھا۔ اتوار کے روز ہمارا پروگرام ایک بار پھر شکار پر نکلنے کا تھا۔ شوکت کے ایک حوالدار دوست محمد کا مشورہ تھا کہ اس مرتبہ سائفن پر جا کر مچھلی کا شکار کیا جائے۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک عورت کی تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ یوں لگا کہ وہ شدید خوف کے عالم میں واویلا کرتی ہوئی ہماری طرف آ رہی ہے۔ وہ تھانے کے برآمدے میں پہنچی، پھر کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور وہ دیوانہ وار اندر آ گئی۔ عورت جواں سال تھی۔ وہ خالص دیہاتی لباس یعنی نیلی دھوتی...... اور کھدر کے موٹے سفید کُرتے میں تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ایک بچہ اس کی کمر سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں خوف کا دریا بہہ رہا تھا۔ وہ چیختی ہوئی انسپکٹر شوکت کی طرف بڑھی۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ اس سے لپٹ ہی جائے گی۔ شوکت کے بالکل قریب جا کر وہ رک گئی۔ اس نے اپنا چہرہ دروازے کی طرف موڑا۔ ہاتھ بھی دروازے کی طرف اٹھایا اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار صاحب......
......وہ میرے پیچھے آ رہا ہے............ وہ مجھے مار دے گا۔ مجھے بچا لو تھانے دار جی......''

وہ خوف کے عالم میں شوکت کے بالکل نزدیک چلی آئی تھی۔ شوکت نے اسے اپنے ہاتھ سے دھکیل کر ذرا سا پیچھے کیا اور پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ہم بھی ہکا بکا کھڑے تھے۔ اسی دوران میں سے باہر دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔

عورت ایک بار پھر ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''تھانیدار جی......وہ آ رہا ہے......وہ مجھے قتل کر دے گا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ گھوم کر شوکت کی اوٹ میں ہو گئی۔ بھاگتے قدموں کی آواز ہم سب نے سن لی تھی۔ شوکت نے اضطراری کیفیت میں اپنا سرکاری ریوالور ہولسٹر میں سے نکال لیا اور تذبذب کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا، بھاگتے قدم اب برآمدے میں تھے اور یہ ایک سے زیادہ افراد کے قدم تھے پھر دروازے پر ایک نوجوان لیکن نیم گنجا شخص نظر آیا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ حیرت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ باغ پور کے اکلوتے دواخانے کا کمپاؤنڈر رحمت تھا۔ اس کے عقب میں حیران چہروں والے تین چار افراد اور تھے وہ رحمت کے پیچھے برآمدے میں ہی رک گئے تھے۔

''کیا معاملہ ہے رحمت؟'' شوکت نے پوچھا۔

رحمت نے ہانپتی ہوئی سانسوں پر بہ مشکل قابو پایا اور بولا۔ ''ہمیں تو خود کوئی پتا نہیں جناب...... ہم تو چیخنے چلانے کی آواز سن کر باہر آئے تھے پھر اس بی بی کے پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔''

عورت اب بھی بے حد خوفزدہ نظروں سے برآمدے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی کمر سے چمٹا ہوا شیر خوار بچہ بھی اس خوف و ہراس میں برابر کا شریک تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا۔ پہلے تو شاید وہ سکتے کی کیفیت میں تھا مگر اب اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

عورت کا خوف کم کرنے کے لیے میں نے حوالدار فدا حسین سے کہا کہ وہ رائفل بردار سنتری کے ساتھ باہر کے دروازے پر کھڑا ہو جائے۔ شوکت نے عورت کو تسلی تشفی دی اور اسے کہا کہ ہم سب کی موجودگی میں کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ جائے اور ساری بات بتائے۔ عورت لرزتی کانپتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس نے اب بچے کو سینے سے چمٹا لیا تھا۔ اے ایس آئی محمد نذیر نے اسے پانی پلانا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ سخت سردی میں بھی عورت کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اس نے

اپنا دوپٹا منہ پر رکھا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ...... سمجھیں گے میں جھوٹ بول رہی ہوں...... یا میرا دماغ چل گیا ہے میں قسم کھاتی ہوں...... مم...... میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مجھے دھوکا نہیں ہوا...... وہ...... وہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔''

''کون صاف نظر آ رہا تھا؟'' شوکت نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! میں جھوٹ نہیں بول رہی وہ بندہ نہیں تھا...... وہ ضرور کوئی ہوائی چیز تھی...... وہ کوئی...... بلا تھی تھانے دار جی......'' عورت کا انداز رونگٹے کھڑے کرنے والا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا تھا اور خشک ہونٹ کانپتے چلے جا رہے تھے۔ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔ میرے اشارے پر نذیر نے اصرار کر کے اسے دو گھونٹ پانی پلایا۔

وہ ہمیں بہت کچھ بتانا چاہ رہی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بتائے۔ اس کے ذہن اور اس کی زبان میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک رونے کے بعد وہ بولی۔ ''تھانے دار جی! میرا کھاوند (خاوند) بشیر کھیتوں کو پانی لگانے گیا ہوا ہے۔ میں گھر میں اکیلی ہوں میں نے دروازے اندر سے بند کیے ہوئے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں چھوٹے کو پیشاب کرانے کے لیے باہر صحن میں آئی۔ پیشاب کرا کے واپس جانے لگی تو نلکے کے پاس ایک پرچھانواں سا نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا...... اللہ جھوٹ نہ بلوائے...... وہ بندہ نہیں تھا۔'' عورت کی آواز ایک بار پھر خوف سے لرزنے لگی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کا سر دو بندوں جتنا بڑا ہے تھانے دار جی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے چار ہاتھ ہیں وہ کوئی بہت بڑا...... بڑا اوا ہے۔ ڈر کے مارے میری تو چیخیں نکل گئیں۔ میں دروازہ کھول کر باہر بھاگی۔ وہ چھلانگیں لگاتا ہوا میرے پیچھے آیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا...... مم...... میں بس دوڑتی ہی چلی آئی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ میں نے مڑ کر دیکھ لیا تو میں مر جاؤں گی۔ تھانے کی بتی جل رہی تھی۔ میں بس بتی کو دیکھتی رہی اور دوڑتی ہوئی یہاں آ گئی......''

عورت کی پوری بات سننے کے بعد ہمارے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ

گئے۔ شوکت نے گہری سانس لیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ کمپاؤنڈر رحمت کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ نظر آئی۔ یہ بات واضح محسوس ہو رہی تھی کہ عورت کسی وجہ سے بری طرح ڈر گئی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی شدید خوف کی حالت میں کہہ رہی تھی۔ ماسٹر ریاض بشیر جو ابھی تک سانس روکے کھڑا تھا، اب نارمل نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بہن! تم نے تو ہم سب کو ڈرا ہی دیا تھا۔ ہم نے سمجھا پتا نہیں کیا آفت آ گئی ہے؟''

عورت کی آنکھوں میں حیرت انگیز الجھن تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بالکل ''خالی الذہن'' ہو گئی ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کس بات کا کیا جواب دے۔ اس کی عمر بہ مشکل چوبیس پچیس سال رہی ہو گی۔ تاہم دیہات میں ناکافی سہولتوں اور کڑی مشقتوں کی وجہ سے عورتیں تیز رفتاری کے ساتھ جوانی کے دور سے گزر جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تو تین چار بچوں کی ماں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ تین چار بچوں کی دادی ہے۔ ہم لوگ اکثر دیہات کی صاف آب و ہوا اور خالص خوراک کا ذکر کرتے ہیں اور اس حوالے سے دیہاتیوں کی قابلِ رشک صحت کا ذکر بھی ہوتا ہے، لیکن میں نے نتیجہ نکالا ہے کہ قابلِ رشک صحت کا یہ اصول ہر کسی پر لاگو نہیں ہوتا۔ ہم جالندھر میں رہتے تھے جب کہ میری والدہ کی ہم عمر سہیلیاں نواحی دیہات کی رہائش پذیر تھیں۔ میں نے اکثر والدہ کی سہیلیوں کو دیکھا وہ مجھے والدہ سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ لگیں۔ کچھ اس سے ملتی جلتی حالت والد کے دوستوں کی بھی تھی۔ بہرحال بات کسی اور طرف نکل گئی ہے۔ میں ایک سرد رات کا ذکر کر رہا ہوں اور اس دیہاتی عورت کا ذکر کر رہا ہوں، جو ابھی تک خوف سے کانپ رہی تھی اور اپنے منہ بسورتے بچے کو سینے سے لگائے انسپکٹر شوکت کے کمرے میں انگیٹھی کے پاس کھڑی تھی۔

شوکت نے عورت سے پوچھا۔ ''بی بی! تیرا خاوند کون ہے؟''

کمپاؤنڈر رحمت کے ساتھ آیا ہوا ایک شخص بولا۔ ''جناب وہی بشیرا، جس کا کھیت ٹوٹیوں والے کھوہ کے پیچھے ہے۔ بشیر نے پچھلے سے پچھلے ہفتے بابے نورے کے کیس میں گواہی دی تھی۔''

شوکت کو یاد آ گیا کہ یہ بشیرا کون ہے۔ اس نے کمپاؤنڈر رحمت سے کہا کہ وہ اسی

وقت بشیرے کے پاس کھیت میں جائے اور اسے بتائے کہ اس کے گھر میں کیا تماشا ہوا ہے۔ کمپاؤنڈر رحمت نے مستعدی سے سر ہلایا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس قسم کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں ابھی جاتا ہوں اس کھوتے کے پاس...... کان کھینچتا ہوں اس کے۔ وہ ایک نمبر کا بے وقوف ہے۔ بھلے مانس! اگر رات کو کھیت میں جانا ہی ہے تو گھر میں کسی کو چھوڑ کر جا۔ بس منہ اٹھایا اور چل پڑے۔''

عورت نے باریک سی آواز میں کہا۔ ''ڈاکٹر! تم سمجھ رہے ہو کہ میں ڈر گئی ہوں...... میں...... بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میری زبان سڑے اگر میں جھوٹ بولوں۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بی بی رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔ تھانے دار صاحب نے اب کمرہ بند کرنا ہے۔ تُو بھی گھر جا۔ ابھی تیرا خاوند بھی آ جاتا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

''نہیں...... نہیں۔ میں نے اب گھر نہیں جانا۔'' وہ اپنے ہاتھ اور سر کو ایک ساتھ نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔ آنکھوں میں سیاہ خوف منجمد تھا۔

کمپاؤنڈر کے ساتھ آنے والے افراد میں سے ایک عمر رسیدہ شخص بولا۔ ''زبیدہ پتر! چل میں تیرے ساتھ چلتا ہوں، تیری ماسی کو بھی لے لیتے ہیں۔ بشیرا بھی بس ابھی آتا ہی ہوگا...... چل شاباش!''

عورت کا نام زبیدہ تھا۔ گھر واپس جانے کے تذکرے نے اس کے گندمی چہرے کو پھر اندیشوں کی آماج گاہ بنا دیا تھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ پاؤں جیسے پتھرا گئے تھے۔ شوکت نے عمر رسیدہ شخص کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑی محبت سے زبیدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گیا۔ دیگر افراد بھی اس سلسلے میں بوڑھے کی مدد کرنے لگے۔ دو چار منٹ بعد وہ اسے سمجھا کر باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر شوکت وغیرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

زبیدہ نامی عورت کے جانے کے بعد ہم پھر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ انگیٹھی میں

تھوڑی سی آگ ابھی باقی تھی اور پاؤ ڈیڑھ پاؤ مونگ پھلی بھی ہنوز میز پر پڑی تھی۔

شوکت نے کہا۔ ''ایسے علاقوں میں ایسے تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ بندہ جتنا سادہ لوح ہوتا ہے اتنی ہی جلدی خوف زدہ بھی ہو جاتا ہے۔''

''لیکن یار! یہ بھی تو زیادتی ہے کہ جوان عورت اور بچے کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر خاوند صاحب رات بھر کھیتوں میں گھومتے رہیں۔ گھر کا کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ دسمبر کی پہاڑ جیسی کالی رات اور گھر میں اکیلی عورت! اسے بھوت نظر نہیں آئیں گے تو کیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے جناب کہ کوئی واقعی بشیرے کے گھر میں گھسا ہو۔'' اے ایس آئی نذیر خان نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں...... یہ بھی ممکن ہے۔'' میں نے تائید کی۔

''لیکن وہ مٹکے جتنا سر، چار ہاتھ اور ٹیڑھی ٹانگیں......؟'' شوکت نے کہا۔

''بھئی...... وہ تو جب بندہ ڈر جائے...... تو پھر سب کچھ نظر آ سکتا ہے۔ وہ کیا مثال ہے کہ رسّی کا سانپ اور اژدھا بن جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایک مرتبہ سیالکوٹ روڈ پر جاتے ہوئے ہمیں بھی ایک کنگ سائز جن نظر آیا تھا۔ کوئی سوفٹ اونچا تو ہوگا۔'' شوکت نے کہا۔

''اپنا سایہ دیکھا ہوگا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں یار، ہم سرکاری جیپ پر تھے۔ دراصل ہمارے آگے جانے والی کسی کار کی ہیڈ لائٹ سڑک پار کرتے راہ گیر پر پڑی تھی۔ اس کا بہت بڑا پرچھانواں سامنے گرد کے بادل پر پڑا اور یوں لگا جیسے کسی سوفٹ اونچی بلا نے سڑک پار کی ہے۔ یہ حوالدار فدا حسین بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یہ تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔''

''یہ ILLUSIONS ہوتے ہیں تم اسے بصری واہمہ بھی کہہ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔ حوالدار نے ڈرتے ڈرتے گفتگو میں حصہ لیا۔

''جناب، آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں ہماری سمجھ آپ کی سمجھ کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی لیکن یہ بات تو سب مانتے ہیں کہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں۔ آگ ہوتی ہے تو دھواں نکلتا

ہے۔ اگر ایک اچھا بھلا بندہ ڈرتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے......''

کچھ دیر تک اس موضوع پر بات چیت ہوتی رہی پھر مونگ پھلی ختم ہوگئی اور انگیٹھی بھی ٹھنڈی ہوگئی۔ ہم جانے کے لیے اٹھ گئے۔ جانے سے پہلے شوکت نے اے ایس آئی نذیر کو ہدایت کی کہ وہ سونے سے پہلے ایک چکر بشیرے کے گھر کا لگا آئے۔ اس نے نذیر کو مچھلی کے شکار کے لیے دو اچھے جال لانے کا بھی کہا تھا۔ نذیر نے کہا کہ کل دوپہر تک جال پہنچ جائیں گے، لیکن اگلے روز دوپہر سے بہت پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے سارا پروگرام درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

میں اور شوکت صبح سویرے چہل قدمی کے لیے نکلے۔ ہم دونوں شلوار قمیص میں تھے۔ ہمارے منہ میں کیکر کی مسواکیں تھیں۔ گاؤں کی شفاف ہوا میں صبح سویرے اوس سے بھیگے ہوئے سبزے کو دیکھنا اور دھند میں لپٹی ہوئی فصلوں کے درمیان چلنا ایک دلچسپ تجربہ ہوتا ہے۔ رہٹ کی ٹھٹھری ہوئی آواز کانوں میں گونجتی ہے ڈیزل انجن کی ''کو......کو'' سماں باندھتی ہے۔ پاؤں کے نیچے سردی سے اکڑی ہوئی گھاس چرچراتی ہے، مویشیوں کے نتھنوں سے دھواں خارج ہوتا ہے، کھیتوں کے درمیان کسانوں کے ڈیروں پر جلتی ہوئی آگ کسی خوش ادا حسینہ کی طرح دلکش محسوس ہوتی ہے۔ دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ وہ بڑا خوش نما منظر ہوتا ہے، اجالا گہری تاریکی میں سرایت کر کے آہستہ آہستہ پرندوں، درختوں اور کچے مکانوں کی چھتوں پر اترتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ فطرت بہشت کے پاکیزہ پانیوں سے نہا دھو کر آسمان سے زمین کا رخ کر رہی ہے۔

اس روز بھی ہم اس منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گاؤں سے کھیتوں کی طرف نکل رہے تھے۔ ہم تھانے کے قریب سے ہو کر آگے بڑھے۔ رات والی بات ہم دونوں کے ذہنوں سے محو ہو چکی تھی۔ شاید ڈیک نالے کے کنارے چلتے ہوئے ہم دوبارہ اس موضوع پر بات کرتے لیکن...... فی الوقت ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا۔ اچانک ایک لرزا دینے والی خوف زدہ چیخ فضا میں ابھری اور گلیوں میں دور تک گونج گئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے بین کرنے کی آواز سناٹے میں پھیلنے لگی۔ میں اور شوکت ٹھٹک کر رک گئے۔ پھر ہم ایک ساتھ آواز کی طرف بھاگے۔ صبح صبح مسجد سے نکلنے والے ایک دو

مازی بھی ہمارے ساتھ ہی آواز کے رخ پر دوڑے۔ آواز کا ماخذ گلی کا نکڑ والا مکان تھا۔ ب سے پہلے ہم دونوں ہی مکان کے چوبی دروازے تک پہنچے اس وقت میرے علاوہ وکت کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ یہی بشیرا اور زبیدہ کا گھر ہے۔ شوکت نے زور زور سے رواز ے پر دستک دی اور پکار کر کہا۔ ''دروازہ کھولو۔''

دوسری، تیسری دستک پر ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ زبیدہ نامی عورت جس سے ات تھانے میں ملاقات ہوئی تھی۔ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلا رہی تھی اور بین کر ہی تھی۔ ''ہائے میں لٹ گئی...... ہائے میں برباد ہوگئی۔''

وہ سر پاؤں سے ننگی تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر وہ واپس صحن کی طرف بھاگی۔ شوکت ور میں اس کے عقب میں گئے پھر جیسے زمین نے ہمارے قدم پکڑ لیے۔ صحن کے عین رمیان کوئی ٹھٹھری ہوئی کچی زمین پر پڑا تھا۔ ایک کسّی اس کے قریب دھری تھی۔ ہم نے ملگجے اندھیرے میں دیکھا۔ زبیدہ دونوں بازو پھیلا کر بے حرکت جسم سے لپٹ گئی تھی اور جگر پاش آواز میں واویلا کر رہی تھی۔

''کون ہے یہ؟'' میں نے شوکت سے پوچھا۔

شوکت دھیان سے زمین پر پڑے ہوئے شخص کا چہرہ دیکھ چکا تھا۔ وہ ستے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہی بشیرا ہے...... ختم ہو چکا ہے۔''

زبیدہ کے بین دل ہلا دینے والے تھے۔ پہلی بار جب کسی قریبی عزیز کی موت کا علم ہوتا ہے تو رونے والوں کی آوازیں کرب کی انتہا کو چھو رہی ہوتی ہیں۔ ایسی آوازوں کو سننا سماعت کے لیے کڑے امتحان کی طرح ہوتا ہے۔ خاص طور پر حساس لوگوں کے لیے یہ صورتِ حال تکلیف دہ ہوتی ہے۔ میں بھی تکلیف محسوس کر رہا تھا، لیکن سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایک شخص اندر سے لالٹین اٹھا لایا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں مرنے والے کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ وہ ایک جواں سال کسان کا چہرہ تھا۔ یہ زبیدہ کے سر کے سائیں کا چہرہ تھا اور یہ چہرہ بتا رہا تھا کہ اس گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ رات والے واقعات میرے ذہن میں تمام تر شدتوں کے ساتھ ابھر آئے تھے اور رگ و پے میں سنسنی کی لہریں

دوڑنے لگی تھیں۔ کیا زبیدہ نے کل رات جس سنسنی خیز خوف کا اظہار کیا تھا وہ سچا تھا۔

میں نے جھک کر لاش کا معائنہ کیا۔ مرنے والا تہبند اور کُرتے میں تھا۔ ہاتھ کا بنا ہوا ایک نیلا سویٹر اس نے پہن رکھا تھا۔ اس سویٹر پر شبنم آلود مٹی کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ مرنے والے کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ تاہم آثار سے نظر آتا تھا کہ اس کی گردن دبائی گئی ہے۔ دم گھٹ کر مرنے والے اکثر افراد کی طرح بشیر کا منہ بھی کھلا تھا اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ شوکت نے اپنے تجربہ کار ہاتھوں سے لاش کی سختی کا اندازہ لگانے کے بعد کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسے مرے ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح باغ پور اور باغ پور سے باہر پھیل گئی۔ لوگ گروہ در گروہ بشیرے کے گھر کے سامنے جمع ہونے لگے۔ ان میں بشیرے کے عزیز و اقارب بھی شامل تھے۔ بشیر کی بیوی زبیدہ پر غشی طاری ہوگئی تھی اور کمپاؤنڈر رحمت کے علاوہ ایک حکیم صاحب اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شوکت نے پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے باہر سے کسی کو گھر میں داخل نہیں ہونے دیا۔ گھر کا بیرونی دروازہ اندر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔

ان دنوں دیہات میں کُھرا اٹھانے والے کھوجیوں کی بہت اہمیت تھی۔ ان لوگوں کی تجربہ کار نگاہیں زمین پر بہت سے ثبوت ڈھونڈ نکالتی تھیں۔ اکثر یہ لوگ خاندانی ہوتے تھے اور کھوج کا کام نسل در نسل ان میں سفر کرتا تھا۔ بعض کھوجیوں کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا تھا کہ وہ کھرا دیکھ کر چلنے والے کی عمر، جنس، جسمانی حالت اور ذہنی کیفیت کا سراغ دے دیتے تھے اور یہ بات صرف ماضی کی نہیں ہے، آج کل بھی کئی علاقوں میں جرائم کی وارداتوں کا سراغ لگانے کے لیے پیشہ ور کھوجیوں سے مدد لی جاتی ہے اور ان کی فراہم کردہ اطلاعات کو قرار واقعی اہمیت دی جاتی ہے۔ باغ پور نامی اس گاؤں میں بھی دو تجربہ کار کھوجی موجود تھے۔ دونوں باپ بیٹا تھے۔ جواں سال بیٹے کا نام نیاز علی تھا اور اپنے کام میں اس کی مہارت قابلِ ذکر تھی۔ ان کھوجی باپ بیٹے پر شوکت بھی خاصا اعتماد کرتا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو نیاز اور اس کے باپ نے رسا گیری کے ایک اہم معاملے میں شوکت کو قیمتی معلومات فراہم کی تھیں۔

جونہی دن کا اجالا پوری طرح پھیلا شوکت کے بلاوے پر دونوں باپ بیٹا آن حاضر ہوئے۔ انہوں نے شوکت اور اے ایس آئی نذیر کے ساتھ مل کر تقریباً آدھ گھنٹے تک جائے واردات کا معائنہ کیا۔ مقتول کی لاش برآمدے میں لے جائی جا چکی تھی۔ انہوں نے لاش کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے شوکت کے سامنے جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا وہ کچھ یوں تھا۔

بشیرے کے گھر میں کوئی اجنبی بندہ داخل ہوا ہے۔ زیادہ توقع اس بات کی ہے کہ یہ بندہ قصبے کا مکین نہیں تھا۔ قیافہ کہتا ہے کہ یہ درمیانے قد کا ایک فربہ اندام گٹھا ہوا شخص ہے۔ واردات کے وقت پاؤں سے ننگا تھا۔ اس کے پاؤں چوڑے اور موٹے ہیں۔ وہ مقتول پر سامنے سے حملہ آور ہوا اور پھر اسے گرا کر وہ اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ مقتول نے اپنا آپ بچانے کی کافی کوشش کی۔ اس کی جدوجہد کے آثار کچی زمین پر موجود تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مقتول کے قریب پڑی ہوئی ''کسّی'' بھی دفاع کی کوشش میں استعمال ہوئی ہو۔

اس واردات کی شدت کو محسوس کرنے کے بعد اور مقتول کو قریب سے دیکھنے کے بعد میرے اندر صحافیانہ حس بھی پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ سچ کی تلاش ایک اچھے صحافی کے مزاج کا حصہ ہوتی ہے۔ اخبار کی ملازمت کے بعد میں نے چند ماہ تک کرائم رپورٹر کے طور پر بھی کام کیا تھا اور اس تجربے کو خاصا انجوائے بھی کیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تجسس اور حقیقت کی کھوج کا میلان میرے اندر موجود ہے۔ اب یہی میلان پھر سے متحرک ہوا تھا اور میرے ذہن کو...... چبانے کے لیے سوچ کا نوالہ مل گیا تھا۔

جس وقت شوکت اور نذیر وغیرہ کھوجیوں سے بات چیت کر رہے تھے، میں ٹہلتا ہوا گھر کی عقبی سمت میں نکل گیا۔ اس طرف بھی ایک چھوٹا سا کچا صحن موجود تھا۔ نیچی چھت والے دو تین چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے ایک میں اُپلے بھرے تھے، دوسرے میں ٹوٹے ہوئے ہل، پنجالیاں اور چارپائیاں وغیرہ اسٹور کی گئی تھیں۔ ایک کوٹھری نما کمرا چھت تک بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کمرے میں نگاہ دوڑائی تو مجھے بھوسے کے اندر ایک خلا سا محسوس ہوا۔ یوں لگا کہ یہاں سے کسی نے دانستہ بھوسا ہٹایا ہے اور بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی ہے۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو شک یقین میں بدلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی

جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی، لیکن خلا اب خالی پڑا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ یہ پورا کمرا ہی خالی ہو۔ کسی قریبی کمرے سے زبیدہ کے بَین کرنے کی آوازیں پھر سنائی دینے لگی تھیں۔

اچانک میری نظر گنے کے چند چھلکوں پر پڑی۔ یہ چھلکے خلا کے اندر موجود تھے۔ چھلکوں کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ وہ زیادہ باسی نہیں ہیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شخص رات کو بھوسے کے اندر اس گڑھے میں چھپا رہا ہے اور اس دوران میں گنا چوستا رہا ہے۔ کیا یہ وہی شخص ہے جس نے بشیرے پر حملہ کیا ہے؟ یہ سوال جتنا سنگین تھا اتنا ہی سنسنی خیز بھی تھا۔

میں نے فوراً شوکت کو بلایا اسے بھوسے کے ڈھیر میں موجود یہ گڑھا دکھایا۔ شوکت کے چہرے پر بھی سوچ کی پرچھائیاں گہری ہوگئیں۔ وہ گیا اور تھوڑی دیر بعد روتی بلکتی زبیدہ کو اپنے ساتھ لے کر پچھواڑے کی اس کوٹھڑی میں آ گیا۔ اس نے زبیدہ کو بھوسے میں موجود گڑھا دکھایا اور گنے کے تازہ چھلکے بھی دکھائے۔

زبیدہ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ بھوسے میں یہ گڑھا پہلے موجود نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ رات کو یہاں کوئی چھپا رہا ہو...... اور یہ یہی چھپنے والا ہو جس نے بعد ازاں صبح منہ اندھیرے بشیرے پر جان لیوا حملہ کیا ہو۔ باتیں کرتے ہوئے زبیدہ کی آواز بیٹھی جاتی تھی اور اس کا رنگ ہلدی ہوجاتا تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی۔ زبیدہ اب اس اندوہناک واقعے کے حوالے سے جن بھوت یا ہوائی چیزوں کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔ وہ نامعلوم قاتل کو جس انداز میں بددعائیں دے رہی تھی اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی اب ہم سب کی طرح قاتل کو جیتا جاگتا انسان ہی سمجھ رہی ہے۔ وہ کسی جن بھوت کو اپنے خاوند کا قاتل نامزد کرسکتی تھی۔ اس تاریک ٹھٹھری ہوئی رات میں جو کچھ ہوا تھا وہ ہم سب کے سامنے تھا اور نہایت ٹھوس حقیقت کی صورت میں تھا۔

دھوپ اب کافی اوپر آ گئی تھی۔ کھرا اٹھانے کا کام مکمل ہوچکا تھا۔ دیگر شہادتیں بھی محفوظ کرلی گئی تھیں۔ شوکت نے گھر کا بیرونی دروازہ کھلوا دیا اور مقتول کے روتے بَین کرتے لواحقین کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اپنے کشیدہ اعصاب کو پُرسکون کرنے

کے لیے شوکت حسبِ عادت ایک دو سگریٹ پھونکنا چاہتا تھا۔ وہ میرے ساتھ گھر کی چھت پر چلا گیا۔ ہم ایک گوشے میں موڑھوں پر بیٹھ گئے اور تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ میں نے شوکت سے پوچھا۔ ''کیا بات سمجھ میں آتی ہے؟''

وہ بولا۔ ''تم بھی تو خیر سے صحافی ہو اور کرائم رپورٹر بھی رہے ہو۔ تمہارا ذہن کیا کہتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میرا اندازہ تو یہی ہے کہ قاتل شروع رات سے ہی اس گھر میں موجود تھا۔ عورت تو اس کی جھلک دیکھ کر گلی میں بھاگ گئی اور وہ پچھواڑے کوٹھڑی میں بھوسے کے اندر چھپ گیا یا عین ممکن ہے وہ گھر میں کسی اور جگہ چھپا ہو اور بعد میں بھوسے والی کوٹھڑی کے اندر گیا ہو۔ بہرحال عورت تھانے پہنچی پھر وہ محلے داروں کے ساتھ گھر واپس آ گئی، بعد میں بشیرا بھی آ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں عورت کی وجہ سے صورتِ حال زیادہ سنگین ہوگئی۔''

''کیا مطلب؟''

''اگر قاتل کو دیکھ کر عورت یعنی زبیدہ ضرورت سے زیادہ خوفزدہ نہ ہوتی اور الٹی سیدھی باتیں نہ کرتی تو اس کی اطلاع کو اہمیت دی جاتی۔ عین ممکن ہے کہ تم بھی سوچتے کہ بشیرے کے گھر کی تلاشی ہونی چاہیے لیکن زبیدہ نے یہ بتا کر کہ اس نے چار ہاتھوں اور مٹکے جیسے سر والا بھوت دیکھا ہے۔ اپنی اطلاع کو ناقص کرلیا۔ ہم سب یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ وہ اکیلے میں ڈر گئی ہے۔ کیا خیال ہے، میں درست کہہ رہا ہوں نا؟''

شوکت نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ بشیرے نے بھی زبیدہ کی بات کو زیادہ اہمیت نہ دی ہو۔ زبیدہ سے تسلی تشفی کی باتیں کر کے بشیرے نے اسے مطمئن کر دیا۔ دونوں کمرے کے اندر کنڈی چڑھا کر سو گئے......

رات آخری پہر بشیرے کو دوبارہ کھیتوں پر جانا تھا۔ اس نے زبیدہ کو اٹھانا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ اپنی کسّی لے کر خاموشی سے باہر نکل آیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ گھر کے ایک گوشے میں موت چھپی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اب دو امکانات ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قاتل نے بشیرے کے لیے ہی اس گھر میں گھات لگا رکھی تھی۔ لہٰذا جب اس نے تاریکی میں

بشیرے کو تنہا دیکھا تو اس پر حملہ کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ دوسرا امکان یہ ہو سکتا ہے کہ قاتل بشیرے سے الجھنا نہ چاہتا ہو۔ اس کا کوئی اور مقصد ہو۔ بشیرا بد قسمتی سے خود ہی کسی وجہ سے بھوسے والی کوٹھڑی میں پہنچ گیا ہو۔ پناہ گاہ میں چھپے ہوئے شخص نے خطرہ محسوس کیا ہو اور بشیرے پر جھپٹا ہو۔ بشیرا ڈر کر بھاگا ہو۔ صحن میں پہنچ کر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس سنگین کشمکش میں بشیرے کی جان چلی گئی ہو۔''

''تمہیں تو پولیس میں ہونا چاہیے۔ کم از کم میرے پائے کے تھانے دار تو بن ہی سکتے تھے۔ یہی دونوں امکان میرے ذہن میں بھی ہیں۔'' شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اے ایس آئی نذیر موقع پر موجود لوگوں کے بیانات قلم بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا، میں اور شوکت گفتگو میں مصروف رہے۔ واردات کے وقت گھر میں بشیرے کے علاوہ صرف اس کی بیوہ زبیدہ موجود تھی۔ سب سے پہلے لاش بھی اس نے دیکھی تھی۔ زبیدہ بہ ظاہر تو سیدھی سادی عورت نظر آتی تھی۔ چہرے مہرے سے نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی مجرمانہ سازش میں شریک ہو سکتی ہے لیکن اسے اتنی جلدی بری الذمہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

وہ جوان تھی، جسم بھرا بھرا تھا، قبول صورت بھی تھی۔ بلکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے خوش شکل بھی کہا جا سکتا تھا۔ زن، زر اور زمین والی تین طاقتیں کسی بھی جگہ کسی بھی وقت گل کھلا سکتی ہیں۔ دیہات میں اس قسم کے گل کھلنے کا امکان کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

تمام کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد شوکت نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے تحصیل اسپتال بھجوا دیا۔ اس کے بعد تفتیش کا آغاز ہوا۔ اگلے روز ہفتہ تھا، ہم نے شکار کا گرما گرم پروگرام بنا رکھا تھا لیکن یہ پروگرام مکمل طور پر غتربود ہو گیا۔ تفتیش میں مجھے بھی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی لہٰذا میں شوکت کے ساتھ تھا۔ مقتول بشیرا کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔ کسی سے اس کی کوئی خاص دشمنی بھی نہیں تھی۔ چند روز پہلے اس نے رسّہ گیری کے ایک کیس میں گواہی دی تھی لیکن یہ بھی کوئی ایسا سنگین معاملہ نہیں تھا جس کی وجہ سے اس کی جان ہی لے لی جاتی۔ تفتیش کے دوران میں ایک اور بات کا پتا چلا۔ چند ہفتے پہلے ایک قریبی گاؤں میں ہونے والے میلے میں بشیرے کا جھگڑا طفیل نامی ایک نوجوان سے ہوا

تھا۔ طفیل کی گھوڑی نے بشیرے کے کپڑوں پر کیچڑ کے چھینٹے اڑائے تھے اور اس وجہ سے بات بڑھ گئی تھی۔ دونوں نے ایک دوجے پر لاٹھیاں چلائی تھیں۔ شوکت نے اس معاملے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ طفیل عرف طیفا قریبی گاؤں کٹھالی کا رہنے والا تھا اس کی شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ باپ اور بھائی اپنے کھیتوں پر کام کرتے تھے لیکن وہ آوارہ پھرتا تھا اور لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ وہ کبڈی کھیلنے کا شوقین بھی تھا۔ طفیل کے باپ کے بہ قول وہ شہر گیا ہوا تھا۔ تیسرے روز شوکت نے مجھے بتایا کہ وہ طیفے کو شاملِ تفتیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دیہاتی زبان میں اسے تفتیش میں ''بٹھانا'' کہتے ہیں۔ شوکت اپنی کھٹارا جیپ میں سوار کٹھالی گاؤں کی طرف روانہ ہوا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ کٹھالی پہنچ کر نمبردار سے معلوم ہوا کہ طیفا نہر پار امرودوں کے باغ میں اپنے دوستوں کے ساتھ موجود ہے۔ ہم نہر کی طرف روانہ ہوئے۔ لگتا تھا کہ ہم شکار پر ہیں لیکن یہ ایک دوسری طرح کا شکار تھا۔ اے ایس آئی نذیر کے علاوہ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل بھی ہمارے ساتھ تھے۔ شوکت کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل تھی۔ ان دنوں دیہات میں موٹر کار یا جیپ وغیرہ کا چلنا کسی تماشے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ راہ گیر رک رک کر ایسی مشینی سواری کا نظارہ کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اَن جانا خوف اور حیرت ہوتی تھی۔ بچے بالے تو انجن کی آواز سن کر بھاگ اٹھتے تھے۔ ایک دو بار میں نے خود بھی اس بھگدڑ کا نظارہ کیا تھا۔ دراصل اسکولوں وغیرہ میں حفاظتی ٹیکے لگانے والی ٹیمیں موٹر گاڑیوں پر ہی دیہات میں وارد ہوتی تھیں۔ گلیوں میں کھیلنے کودنے والے بچے انہی ''ٹیموں'' کے ڈرائے ہوئے تھے۔

ہم امرودوں کے باغ میں پہنچے۔ ایک جگہ چند نوجوان زمین پر چادر بچھا کر بیٹھے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سے طیفے کو اس کے قد کی وجہ سے شوکت نے دور ہی سے پہچان لیا۔ طیفے نے بھی پولیس کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ انداز ڈرا ہوا تھا پھر اچانک یہ ہوا کہ طیفا اپنے پاؤں پر گھوما اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ''رک جاؤ...... خبردار رک جاؤ۔'' شوکت اور نذیرے نے ایک ساتھ پکار کر کہا۔

لیکن وہ رکنے کے لیے نہیں بھاگا تھا۔ نذیر اور کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر جیپ سے اترے اور طیفے کے پیچھے دوڑے۔ وہ سب آگے پیچھے نشیب میں دوڑتے چلے گئے۔

شوکت نے بلند آواز میں اے ایس آئی نذیر کو ہدایت کی کہ ''گولی نہیں چلانی'' ہماری جیپ بلندی پر کھڑی تھی۔ آگے کے سارے کھیت نشیب میں تھے۔ ہم نے جیپ سے پولیس اور طیفے کی بھاگ دوڑ کا شاندار نظارہ کیا۔ وہ واقعی کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ اس نے کانسٹیبلوں کی زبردست دوڑ لگوائی، حالانکہ تینوں کانسٹیبل بھی خاصے جوان اور پھرتیلے تھے۔ اس کے علاوہ ان کانسٹیبلوں کے ساتھ چند کھیت مزدور بھی شامل ہو گئے تھے۔ وہ سب آگے پیچھے سے طیفے کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ بالکل یہی لگا کہ وہ کبڈی کھیل رہا ہے۔ آخر سامنے سے آنے والے ایک گھڑسوار دیہاتی نے طیفے کے کندھے پر اپنی لاٹھی سے وار کیا اور وہ گر گیا۔ کانسٹیبلوں نے باقی افراد کے ساتھ مل کر اسے دبوچ لیا۔

طیفا پکڑا گیا، لیکن پکڑے جانے سے پہلے اس نے جس ہمت اور پھرتی کا مظاہرہ کیا، وہ قابلِ داد تھی۔ شوکت اس کے پاس پہنچا اور تین چار کرارے تھپڑ اس کے منہ پر دھرے۔ وہ ڈری ہوئی ناراض نظروں سے شوکت کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا عام سا دیہاتی نوجوان تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا شخص قتل جیسی واردات کر سکتا ہے لیکن وہ پولیس کو دیکھ کر جس طرح اچانک بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بات سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ بہرحال شوکت نے اس ہتھکڑی لگائی اور جیپ میں بٹھالیا۔

راستے میں شوکت اور نذیر اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری پوری کرتے رہے۔ یعنی طیفے کو ٹھاپیں لگاتے رہے اور عام نوعیت کی پوچھ تاچھ بھی کرتے رہے۔ طیفا مزاج کا سخت تھا اور دلیر بھی نظر آتا تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے والے لوگ جب گاڑی میں بیٹھ کر مار کھانا شروع کر دیتے ہیں تو سخت خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور اکثر باقاعدہ منت سماجت شروع کر دیتے ہیں۔ تاہم طیفے کا حوصلہ ابھی تک ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ بڑی استقامت سے ٹھاپیں کھا رہا تھا اور پولیس والوں کو گھور رہا تھا۔ شوکت نے طیفے سے پوچھا کہ وہ پولیس کو دیکھ کر بھاگا کیوں تھا۔ وہ ناراض اور اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''پچھلے ہفتے گجروں کے منڈے کے ساتھ میری لڑائی ہوئی تھی۔ میں نے سمجھا...... شاید گجروں نے مجھے پکڑوانے کے لیے پلس (پولیس) بھیجی ہے۔ وہ مجھ پر ڈکیتی کا جھوٹا الزام لگا رہے

ہیں۔''

''تیرا دماغ بشیرے کی طرف نہیں گیا جس کا تو نے گل گھوٹو کیا ہے؟'' شوکت نے پولیس والوں کے مخصوص انداز میں اچانک سوال کیا۔

طیفا گڑبڑائے بغیر بولا۔ ''ٹھانے دار صاحب۔ آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ میں کسی کو کیوں ماروں گا......!''

''چلو...... حوالات میں جا کر پتا چلا لیں گے کہ کیوں مارا ہے؟'' اے ایس آئی نذیر نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم ''باغ پور'' کی حدود میں داخل ہو گئے۔ میری نگاہیں بار بار طیفے کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ موقعِ واردات کو ملاحظہ کرنے کے بعد کھوجی باپ بیٹے نے خیال ظاہر کیا تھا کہ بشیرے کا قاتل نہایت گٹھے ہوئے جسم کا شخص ہے اور اس کا قد بھی زیادہ لمبا نہیں۔ طیفا ان دونوں شرائط پر پورا اترتا نظر آتا تھا۔ مجھے اس کی داہنی کہنی پر گہرا نیل بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ نیل تازہ نہیں بلکہ تین چار روز پرانا محسوس ہوتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نیل کا تعلق کسی ''مارکٹائی'' سے ہو...... اور یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ یہ مارکٹائی یا زورآزمائی بشیر کے ساتھ ہوئی ہو۔ بشیرے کے قتل ہونے سے پہلے۔

ذہن میں سوچ کے گھوڑے دور دور تک دوڑ رہے تھے مگر جونہی ہم باغ پور کے اندر داخل ہوئے ''سوچ کے گھوڑوں'' کی اُڑائی ہوئی ساری دھول بے کار محسوس ہوئی۔ اس وقت تک رات کے دس بج چکے تھے، ابھی ہم کھیتوں میں ہی تھے کہ گنے کے ایک کھیت میں لوگوں کا جمگھٹا نظر آیا۔ نہ جانے کیوں اس جمگھٹے کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہماری غیر موجودگی میں یہاں کوئی سنگین نوعیت کی واردات ہوئی ہے...... شاید ایک اور قتل!

کھیت کے کنارے لوگ ایک بڑے دائرے کی شکل میں کھڑے تھے، ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں اور لاٹھیاں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ مدھم آواز میں کسی کے رونے کی صدا بھی سنائی دی۔ عورتوں کی ایک ٹولی کھیت سے کچھ ہٹ کر ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ اردگرد کے سارے کھیتوں میں لوگوں کی چھوٹی بڑی ٹولیاں نظر آ رہی تھیں۔ لالٹینوں کی روشنی میں مجھے اے ایس آئی نیاز اور حوالدار فدا کی صورتیں بھی دکھائی دیں۔

شوکت نے گرفتار شدہ طیفے کو اے ایس آئی نذیر کے حوالے کیا اور اسے کہا کہ وہ تھانے چلا جائے۔ وہ خود باقی عملے کے ساتھ جائے واردات کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایک بوڑھی عورت شوکت کو دیکھ کر زور زور سے بَین کرنے لگی اور اپنا مدقوق سینہ پیٹنے لگی۔ ایک بوڑھا دونوں ہاتھوں میں اپنا سفید سر پکڑے زمین پر گم صم بیٹھا تھا۔ ایک عورت دوپٹا چہرے پر پھیلائے رو رہی تھی۔ ہمیں راستہ دینے کے لیے لوگ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ ہم کھیت میں داخل ہوئے۔ لالٹینوں کی روشنی میں ایک نوجوان لڑکی زمین پر بے سُدھ پڑی دکھائی دی۔ اس کا چہرہ گواہ تھا کہ وہ زندگی کا مختصر سفر ختم کر چکی ہے۔ کسی دیہاتی نے اپنی گرم چادر لڑکی کے جسم پر پھیلا دی تھی۔ شوکت نے جھک کر چادر تھوڑی سی ہٹائی۔ دل لرز گیا۔ لڑکی کی سفید قمیص کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر اور جسم پر گہری خراشوں کے نشان تھے۔ قریب ہی ایک درانتی پڑی تھی۔

شوکت نے لالٹینیں قریب لا کر درانتی کا معائنہ کیا تو ایک دیہاتی جو غالباً اسکول ماسٹر تھا، دل گرفتہ لہجہ میں بولا۔ ''یہ صغراں کی درانتی ہے جی۔ بے چاری چارا کاٹنے کے لیے کھیتوں میں آئی تھی۔''

معلوم ہوا کہ بدنصیب لڑکی کا نام صغراں ہے۔ اگلے چند منٹ میں ہمیں کافی کچھ معلوم ہو گیا۔ کئی دیہاتی ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ان کے لہجوں سے درد و کرب کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا خوف بھی ٹپک رہا تھا۔ صغراں نامی اس لڑکی کے بوڑھے والدین سے پتا چلا کہ وہ شام سے کچھ دیر پہلے چارا لینے کے لیے کھیتوں میں آئی تھی۔ اس کا کاٹا ہوا چارا کچھ دور ایک اور کھیت میں پڑا تھا۔ جب کہ اس کی لاش گنے کے اس کھیت میں پائی گئی تھی۔

اے ایس آئی نیاز نے بتایا کہ اس نے موقع کا اچھی طرح معائنہ کیا ہے۔ بہ ظاہر کوئی ایسی شہادت سامنے نہیں آئی جس سے اندازہ ہو کہ لڑکی کو زبردستی چارے کے کھیت سے گنے کے کھیت میں لایا گیا ہے۔ زمین پر گھسیٹے جانے کے نشان نہیں۔ نہ ہی جائے واردات اور چارے کے کھیت کے درمیان کسی طرح کی جدوجہد کے آثار پائے گئے ہیں۔

اے ایس آئی سمیت ہر شخص کا لہجہ ایک خاص قسم کے ہراس میں لپٹا ہوا تھا، اس ہراس کا تعلق لڑکی کے قتل کے ساتھ ساتھ بشیرے کے قتل سے بھی تھا...... بشیرے کے عجیب و غریب قتل کی بازگشت ابھی تک اس پورے علاقے میں موجود تھی۔ لوگ مختلف چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ بڑی زور و شور سے جادو ٹونے، جن بھوت اور ہوائی چیزوں کا ذکر کیا جا رہا تھا۔ اس خوف و ہراس کی فضا میں اب ایک اور قتل ہو گیا تھا۔

جس وقت شوکت اپنے اے ایس آئی سے مصروفِ گفتگو تھا، میں نے صغراں کی بوڑھی والدہ سے گفتگو کی۔ وہ مجھے بھی سادہ لباس میں پولیس والا ہی سمجھ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ صغراں اس کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ کرماں جلی کے نصیب میں سہاگ کی مہندی نہیں تھی۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہونے والی تھی...... فرطِ غم سے صغراں کی ماں کا سینہ لبریز ہو گیا۔ وہ بلند آواز میں بَین کرنے لگی اور اپنا سینہ کوٹنے لگی وہ پکار رہی تھی۔ ''ہائے میرے ربا! یہ کیا ہو گیا، ہائے میری پھولوں جیسی دھی کے ساتھ کس نے یہ ظلم کیا......''

عورت کے دل دوز نوحے سن کر اور بھی کئی عورتیں رونے لگیں۔

کچھ دیر بعد عورت کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو میں نے اس سے صغراں کے بارے میں کچھ مزید باتیں پوچھیں۔ وہ نوحے کے درمیان بولتی رہی اور میرے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ اس کے اردگرد موجود عورتوں نے بھی کچھ معلومات فراہم کیں۔ ان باتوں کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

صغراں کی شادی ایک صلاح الدین نامی نوجوان سے ہونے والی تھی۔ صغراں اور صلاح الدین آپس میں چچا زاد تھے۔ دونوں کے والد کاشت کاری کرتے تھے۔ ان کے پاس چند ایکڑ موروثی زمین تھی۔ لڑکیوں کی شادیوں کے بعد زمین تقسیم ہو جاتی ہے۔ صغراں اور صلاح الدین کے والدین کی خواہش تھی کہ زمین تقسیم نہ ہو۔

یعنی صغراں کے حصے کی زمین بھی اپنے ہی خاندان میں رہے۔ انہوں نے صغراں اور صلاح الدین کا رشتہ طے کر دیا۔ اب اگلے مہینے دونوں شادی کے بندھن میں بندھنے والے تھے۔ خواتین کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس شادی کے سلسلے میں کوئی چھوٹا موٹا تنازع بھی تھا۔

کچھ دیر بعد شوکت بدنصیب لڑکی کی لاش کو اٹھوا کر...... تھانے لے آیا۔ تھانے کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر طرف سرگوشیاں سرسرا رہی تھیں۔ شوکت نے بدنصیب صغراں کے والدین کے علاوہ اس کے منگیتر صلاح الدین کے وارثوں کو بھی تھانے میں بلا لیا۔ صلاح الدین خود بھی تھانے پہنچ گیا۔ وہ لمبے قد کا خوش شکل دیہاتی نوجوان تھا۔ اس نے نیلا تہبند اور سفید کُرتہ پہن رکھا تھا۔ گرم چادر اس کی گردن کے پیچھے سے ہو کر پہلوؤں پر لٹک رہی تھی۔ اس کا چہرہ پژمردہ تھا۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

صلاح الدین کو دیکھ کر میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ میں نے شوکت سے کہا۔ ''کیا اس لڑکے کے ساتھ مقتولہ صغراں کی شادی بے جوڑ نہیں تھی؟''

''کیا مطلب؟'' شوکت نے کہا۔

''لڑکا خوب جوان اور خوش شکل ہے...... لیکن مرنے والی درمیانی شکل صورت کی ہے...... کیا خیال ہے تمہارا؟''

شوکت نے تائیدی انداز میں اوپر نیچے سر ہلایا۔ یہ نکتہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا اور اس نے ذہن نشین بھی کر لیا تھا۔ ایسی ہی معاشرتی ناہمواریاں ہوتی ہیں جو ناہموار و تلخ حالات کو جنم دیتی ہیں۔

اے ایس آئی نذیر نے مقتولہ کی والدہ سے سوال جواب شروع کر رکھے تھے۔ اس نے عمر رسیدہ عورت سے پوچھا۔ ''چاچی، تمہیں اس واقعے کا پتا کیسے چلا؟''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار جی! صغراں عصر کی اذان کے تھوڑی دیر بعد چارا کاٹنے کھیتوں کی طرف آئی تھی۔ وہ روز ہی آتی تھی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے واپس پہنچ جاتی تھی...... آج اس کو دیر ہو گئی۔ میں نے شام کی نماز افراتفری میں پڑھی اور صغراں کو ڈھونڈنے نکلی۔ قسمت میں لکھا تھا کہ سب سے پہلے میں ہی اپنی مری ہوئی صغراں کا چہرہ دیکھوں۔ ہائے مجھے موت کیوں نہ آ گئی۔ یہ سب دیکھنے سے پہلے......'' وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ بہ مشکل اپنی سسکیاں روکتے ہوئے بولی۔ ''حاجی ہاشم کے کماد کے پاس مجھے زمین پر کوئی شے پڑی نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ میری صغراں تھی۔ اپنی صغراں کی شکل دیکھتے ہی میں چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد جب ہوش آیا تو وہاں

کماد کے کھیت میں پورا گاؤں اکٹھا ہو چکا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر شخص بولا۔ ''ہم بشیرے کے قل پڑھنے گئے تھے۔ وہاں سے واپس آ رہے تھے کہ حاجی ہاشم کے کھیت کی منڈیر پر کسی کو بے ہوش پڑے دیکھا۔ یہ صغراں کی ماں تھی۔ ہم ذرا آگے گئے تو صغراں بھی نظر آ گئی۔ اس کا کرتہ لیرولیر (پھٹا ہوا) تھا اور وہ مری ہوئی تھی۔ ایک دو بندوں نے کہا شاید کوئی سانس باقی ہو لیکن ماسٹر ریاض نے اچھی طرح دیکھ کر بتایا کہ وہ مر چکی ہے۔

دو تین مزید افراد نے بھی یہی بیان دہرایا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ 72 گھنٹے کے اندر اندر یہ دوسرا لرزہ خیز قتل تھا۔ دونوں واقعات پُراسرار رنگ لیے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی تھے۔ مرنے والوں کا گلا گھونٹا گیا تھا اور ان کے جسموں پر کسی بڑے زخم کا نشان بھی نہیں تھا۔ دونوں لاشوں کے پاس ایک ایسا آلہ موجود تھا جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن بہ ظاہر یہ آلہ قتل میں استعمال نہیں ہوا تھا۔ پرسوں بشیرے کی لاش کے پاس کسّی موجود تھی...... آج صغراں کی لاش کے پاس کھیت میں درانتی رکھی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق بھی ہو سکتا تھا اور اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز دونوں واقعات میں مشترکہ تھی۔ یہ مشابہت کافی دلچسپ محسوس ہوتی تھی تاہم عین ممکن تھا کہ یہ بھی محض ایک اتفاق ہو۔ بشیرے کے قتل کے وقت پچھواڑے کی کوٹھری میں بھوسے کے اندر میں نے گنے کے چوسے ہوئے چھلکے دیکھے تھے۔ اب صغراں کی لاش کے پاس بھی ایسے ہی چھلکے نظر آئے تھے۔ شوکت کے علاوہ میں نے بھی یہ چھلکے دیکھے تھے۔

چھلکوں والا ثبوت کوئی اہم ثبوت نہیں تھا لیکن اگر یہ ثبوت واقعی اس امر کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ یہ دونوں قتل ایک ہی شخص نے کیے ہیں...... تو پھر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم جس بندے کو کٹھالی گاؤں سے پکڑ کر تھانے لائے تھے، وہ بے قصور تھا۔ میرا مطلب طیفے سے ہے۔

دونوں کھوجی بھی تھانے میں آ موجود ہوئے تھے۔ یہ لوگ زمین سے گواہی لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ صغراں والے واقعے میں بھی یہ زمین سے گواہی لے سکتے تھے۔ کھیت

میں موجود قدموں کے نشان بتا سکتے تھے کہ بشیرے اور صغراں کا قاتل ایک ہی ہے یا دو مختلف مجرموں کی وارداتیں ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ گواہی مکمل طور پر ضائع ہو چکی تھی۔ صغراں کے قتل کے بعد بے لوگ بے تحاشا کماد کے کھیت میں آئے تھے۔ ایسے میں مجرم کے قدموں کے نشان باقی رہ جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ دیگر چھوٹی موٹی زمینی شہادتوں کے ساتھ یہ نشان بھی غتربود ہو چکے تھے۔ پولیس اگر بروقت ''جائے واردات'' پر نہ پہنچ سکے تو اس قسم کا نقصان تو ہوتا ہی ہے۔

حالات اس لرزہ خیز امکان کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ قتل سے پہلے بدقسمت صغراں کے ساتھ زیادتی بھی کی گئی ہے۔ تاہم اس کا حتمی ثبوت پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ہی مل سکتا تھا۔ شوکت نے فوری طور پر ابتدائی کارروائی مکمل کی اور لاش کو اسپتال بھجوانے کا انتظام کیا۔ رات دس بجے کے لگ بھگ نذیر محمد صغراں کی لاش لے کر ''پوسٹ مارٹم'' کے لیے چلا گیا۔ وہی صغراں، جس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور جو اگلے ماہ انہی تاریخوں میں دلہن بننے والی تھی۔

شوکت نے اس واردات کے حوالے سے تقریباً بیس افراد کے بیانات قلم بند کیے۔ ان سارے بیانات میں سے صرف ایک ایسا تھا جو کسی حد تک اس قتل کے ایک امکان پر روشنی ڈال سکتا تھا۔ یہ بیان صغراں کے والد خدا بخش کا تھا۔ اس بیان کے مطابق اس گھرانے کا ایک نجی تنازع سامنے آتا تھا۔ خدا بخش نے اپنے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میرا ہونے والا داماد صلو (صلاح الدین) اس شادی پر راضی نہیں تھا۔ اس کے گھر والے اس پر زبردستی کر رہے تھے۔ صلو میرا بھتیجا ہے۔ میں اس کی خصلت بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ صغراں سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

صلاح الدین عرف صلو تھانے میں ہی تھا لیکن وہ اپنے والد کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھا۔ شوکت نے خدا بخش سے کہا۔ ''کیا تمہارا خیال ہے کہ صلو کسی اور کو پسند کرتا تھا۔''

خدا بخش بولا۔ ''تھانے دار جی! میں نے ساری زندگی جھوٹ نہیں بولا۔ اب بھی نہیں بولوں گا۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے یا نہیں لیکن آپ نے دیکھا ہی

ہے۔ وہ جوان ہے اور خود کو بہت سوہنا بھی سمجھتا ہے۔ میری دھی وچاری درمیانی شکل و صورت کی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ صلو کا دھیان کسی اور طرف تھا۔''

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو خدا بخش! تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے۔ کھل کر بتاؤ۔ کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ صغراں کے قتل میں تمہارے کسی عزیز کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

خدا بخش بڑی شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''نہیں تھانے دار جی! میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔ مجھے غیب کا علم تھوڑا ہے اور پھر جس کا اتنا بڑا نقصان ہو جائے اس کے لیے تو سارے ہی چور ڈاکو ہوتے ہیں۔ میں کسی پر اتنا بڑا الزام کیوں لگاؤں۔''

شوکت نے غم زدہ خدا بخش کو باہر بھیج دیا اور اسے ہدایت کی کہ جو گفتگو یہاں ہوئی ہے اس کا ذکر باہر نہیں ہونا چاہیے۔ خدا بخش کے جانے کے بعد شوکت مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں صحافی صاحب! اب کیا فرماتے ہیں آپ اس معاملے کے بارے میں؟''

میں نے کہا۔ ''خدا بخش نے واضح طور پر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی کسی کا نام لینے کی ہمت کی ہے لیکن...... اس کی باتوں میں اس کا نکتہ نظر ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اگر پڑھے لکھے انداز میں بات کی جائے تو ہم کہیں گے کہ خدا بخش نے اس واقعے کے حوالے سے لاشعوری طور پر صلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔''

''ہاں۔ یہ بات کوئی ایسی ناممکن بھی نہیں ہے۔'' شوکت نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم فرض کر لیں کہ صلو کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار تھا اور ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا تھا تو پھر وہ صغراں کو راستے سے ہٹانے کا سوچ بھی سکتا تھا۔ اس قسم کے واقعات اکثر مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ جذباتی نوجوان اپنی محبوبہ کے کہنے پر بیوی یا منگیتر یا کسی خونی رشتے دار کو جانی نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے عشق کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ معشوقہ کی آنکھ کے ایک اشارے پر دفعہ 302 کی تختی اپنے گلے میں لٹکا لیتے ہیں۔''

حوالدار فدا حسین نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''جناب! یہ بات تو مجھے بھی پتا ہے کہ صلو اس شادی سے خوش نہیں تھا۔ بس ماں پیو کی وجہ سے مجبوراً شادی کر رہا تھا لیکن...... دل

یہ بات نہیں مانتا کہ وہ اتنا بڑا جرم کر سکتا ہے۔'' وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

'' آپ پھر کہیں گے کہ میں جاہلوں والی باتیں کر رہا ہوں، لیکن جناب! یہ میں ہی نہیں کہتا اور بھی بہت سے لوگ کہہ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے امام مسجد قدرت اللہ صیب نے بھی یہی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دیہہ پر کوئی شیطانی سایہ پڑ گیا ہے۔ ہوائی چیزیں ہیں جو یہ سب کچھ کر رہی ہیں۔''

فدا حسین کی گول آنکھوں میں خوف تھا اور بات کرتے ہوئے اس کے سیاہ ہونٹ پھڑکتے تھے۔ حوالدار تو چلو، سادہ لوح شخص تھا۔ اسے کمزور عقیدے کا بھی کہا جا سکتا ہے لیکن ہم تو سادہ لوح نہیں تھے اور اپنے تئیں ہمارے عقیدے بھی مضبوط تھے، اس کے باوجود ہم عجیب سی سنسنی محسوس کر رہے تھے۔ شاید اسی کو ماحول کا اثر کہتے ہیں۔

موجودہ صورتِ حال میں کچھ لوگ بشیرے کی بیوہ زبیدہ کی باتوں کو پھر سے اہمیت دینے لگے تھے۔ اس نے بشیرے کے قتل سے ایک رات پہلے تھانے میں آ کر جو واویلا کیا تھا، وہ اب سنجیدگی سے سنا اور سنایا جا رہا تھا۔ ایک عجیب الخلقت شخص...... جو بے حد مضبوط اور توانا تھا۔ اس کا سر مٹکے کے برابر تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ اس کے چار بازو تھے اور ناخن خنجروں کی مانند تھے۔ بشیرے کے قتل سے صرف چند گھنٹے پہلے وہ اس کے گھر کے صحن میں پایا گیا تھا۔ جب زبیدہ نے اسے دیکھا تھا تو اس نے اپنے حلق سے ایک ڈراؤنی آواز نکالی تھی، پھر ہوا میں چھلاوے کی طرح اچھلتا ہوا زبیدہ کے پیچھے آیا تھا۔

زبیدہ کے بیان میں مزید باتیں شامل ہوتی جا رہی تھیں۔ رائی کا پہاڑ اور بات کا بتنگڑ اسی طرح بنتا ہے۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ شوکت کو عملے کے دیگر افراد کے ساتھ اغوا کے ایک کیس کی تفتیش کے لیے قریبی گاؤں میں جانا پڑا۔ میں ناشتے کے بعد گاؤں میں گھومنے نکل گیا۔ سب کو معلوم تھا کہ میں تھانے دار صاحب کا دوست اور خصوصی مہمان ہوں۔

وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کر رہے تھے۔ میرے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے، میں ان سے گھلنا ملنا چاہتا تھا لیکن یہ کافی مشکل کام لگتا تھا۔ اگر میں عام حیثیت سے اس خوب

صورت گاؤں میں موجود ہوتا تو شاید اپنی سیر کا زیادہ لطف اٹھاتا۔ میں گاؤں کے دائرے (بیٹھک) میں عام لوگوں کے ساتھ بیٹھتا۔ آگ تاپتا، دودھ پتی پیتا، کھٹی میٹھی باتیں سنتا، پھر کنوئیں پر چلا جاتا۔ تازہ پانی میں نہاتا۔ بچوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا، پانی بھرنے والی دوشیزاؤں کو چور نظروں سے دیکھتا یا پھر شام کو کھیل کے میدان میں پہنچ جاتا۔ باغ پور ہائی اسکول کے لڑکوں کے ساتھ والی بال کھیلتا، یا پھر مقامی ہاکی (کھدو ٹلا) سے لطف اندوز ہوتا...... اور ہاں، پھر ایک اور رومانی پہلو بھی تو تھا۔ شہر کے بابو، گاؤں کی الہڑ مٹیار اور نمبرداروں یا چوہدریوں کے بیٹے کی تکون بڑی پرانی ہے۔ اس تکون پر ان گنت کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ درجنوں تو میں نے بھی پڑھ اور سن رکھی تھیں۔ ایسی کوئی کہانی اور ایسی کوئی الہڑ مٹیار میرے راستے میں بھی آ سکتی تھی مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ میں وڈے تھانے دار شوکت گوندل صاحب کا قریبی دوست تھا۔ لوگ میری عزت کرنے پر مجبور تھے اور میں بھی لوگوں سے فاصلہ رکھنے پر مجبور تھا۔

میں گھوم پھر کر اور ایک بیلنے سے گنے کا تھوڑا سا رس پی کر تھانے کی طرف واپس آ رہا تھا کہ مجھے لحیم شحیم نوازش چاند کی شکل نظر آئی۔ وہ سر پر گول ٹوپی پہنے جھومتا ہوا جا رہا تھا۔ یوں تو وہ شوکت کا مالک مکان تھا لیکن خاص خاص لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ شوکت کا مخبر خاص بھی ہے۔ مجھے دیکھ کر نوازش چاند کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ مجھے ''سر جی'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ منع بھی کیا لیکن اس نے اپنی روٹین برقرار رکھی۔ اس نے میرے قریب آ کر اتنی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا کہ ہاتھ کی ہڈیاں کڑکڑاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

میں نے کہا۔ ''بھائی! میرا کام لکھنے لکھانے کا ہے۔ اتنا مت دبایا کرو کہ لاہور واپس جا کر قلم ہی نہ پکڑ سکوں۔''

وہ میرے فقرے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''سر جی! اچھی بات ہے کہ آپ بھی مل گئے ہیں۔ آپ کے اور شوکت صاحب کے لیے میرے پاس ایک بڑی خاص اطلاع ہے۔ آئیں، میں آپ کو تھانے چل کر بتاتا ہوں۔''

ہم تھانے میں پہنچے۔ وہاں حسبِ توقع شوکت موجود نہیں تھا۔ نوازش چاند بے تابی

سے شوکت کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بار بار اٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا۔ چاند کی حالت اس شخص کی
طرح تھی، جسے بہت زور کا پیشاب آرہا ہو۔ اس کا مثانہ پھٹنے کے قریب ہو لیکن حاجت
روائی کی کوئی صورت نظر نہ آرہی ہو۔ پندرہ بیس منٹ کے انتظار کے بعد چاند بے بس
ہو گیا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ شوکت کی آمد سے پہلے ہی میرے اور اے ایس آئی کے سامنے
پیٹ ہلکا کر لے۔ وہ کرسی گھسیٹ کر ہمارے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''دراصل جب میرے
پاس کوئی خبر ہوندی ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوندا ہے۔ میرا دل چاہندا ہے میں فٹافٹ
یہ اطلاع شوکت صیب تک پہنچا دوں۔ اب شوکت صیب نہیں لیکن آپ تو ہیں۔ آپ اور
شوکت صیب میں بھلا کیا فرق ہے۔''

اے ایس آئی نذیر نے کہا۔ ''چاچا جی! اب سسپنس ہی بڑھاتے رہو گے یا کچھ
بتاؤ گے بھی۔''

چاچا جی کہنے پر چاند اکثر ناراض ہو جاتا تھا، مگر اس وقت چاند کا سارا دھیان اپنی
اطلاع کی طرف تھا۔ لہٰذا وہ محمد نذیر کی نادانی کو نظر انداز کر گیا۔ اس نے مونچھوں کو بل
دے کر کہنا شروع کیا۔ ''شوکت صاحب نے کل میرے ذمے ایک کھاص کام لگایا تھا۔
انہوں نے کہا تھا کہ میں صلو کے بارے میں کھوج شوج لگاؤں۔ پتا کروں کہ کیا سچ مچ وہ
کسی کڑی کے ساتھ پیار کردا ہے اور اگر کردا ہے تو کس کے ساتھ۔ میں اج سارا دن اسی
چکر میں رہا ہوں۔ دونوں سوالوں کا جواب مل گیا ہے۔ صلو ایک کڑی سے پیار کردا ہے۔
یہ تو ہے پہلے سوال کا جواب۔ دوسرے سوال کا جواب بڑا حیران کرن والا ہے۔ میرا خیال
ہے کہ آپ کو بھی ضرور حیرانی ہو گی۔''

''ہم حیران ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ تم بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''سر جی! میں نے جو ٹوہ لگائی ہے اس کے مطابق صلو یعنی صلاح الدین زبیدہ سے
پیار کرتا ہے۔ زبیدہ کو جانتے ہیں ناں آپ...... وہی اللہ بخشے بشیرے کے گھر والی۔ مجھے
پتا چلا ہے کہ وہ دونوں کئی سالوں سے چوری چوری ایک دوجے نال پیار کردے ہیں۔''

نوازش چاند کی اطلاع واقعی کان کھڑے کرنے والی تھی۔ میں نے اس بارے میں
چاند سے ذرا تفصیل کے ساتھ پوچھا۔ اس نے گاؤں کے دو تین افراد کے نام لیے۔ جو

اس اطلاع کی تصدیق کر سکتے تھے۔ چاند کا کہنا تھا کہ صلو اور زبیدہ کے عشق کا چکر پانچ چھ
سال پہلے چلا تھا اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ چکر اب تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔
زبیدہ کی شادی کے بعد گاؤں مین کسی نے بھی کبھی زبیدہ اور صلو کے بارے میں کوئی بات
بھی نہیں سنی مگر اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ وہ ایک دوسرے کو بالکل بھول چکے
ہیں۔

یہ عجیب صورتِ حال تھی اور سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ 72 گھنٹے کے وقفے سے
دو انسان قتل ہوئے تھے۔ قتل ہونے والے دونوں افراد کا تعلق ''زبیدہ اور صلو'' والے
معاملے سے تھا۔ بشیرا...... زبیدہ کا خاوند تھا...... اور بدقسمت صغراں خوب رو صلو کی منگیتر
تھی۔ یعنی قتل ہونے والے دونوں افراد ایک پرانے عشق کے راستے میں رکاوٹ تھے لیکن
فوری طور پر پورے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ابھی تو یہ طے ہونا بھی باقی تھا کہ
چاند نے جو اطلاع ہم تک پہنچائی ہے، وہ کس حد تک درست ہے۔

سہ پہر کے وقت شوکت بھی واپس گاؤں آ گیا۔ چاند کی فراہم کردہ اطلاع شوکت
کے لیے بھی نئی اور اہم تھی۔ چاند کو تھپکی دے کر شوکت نے مزید ٹوہ لگانے کے لیے بھیج دیا۔
اس کے علاوہ اپنے اعتماد کے ایک اور آدمی کی ڈیوٹی بھی اس کام پر لگا دی کہ وہ زبیدہ اور
صلو والے معاملے کی تفصیل معلوم کرے۔ اس دوسرے آدمی کا نام امین تھا اور یہ گاؤں
میں پرچون کی ہٹی (دکان) چلاتا تھا۔ امین نامی اس شخص کو بھی معلوم تھا کہ زبیدہ کی شادی
سے پہلے زبیدہ اور صلو ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

رات نو بجے تک شوکت کو اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو گئیں۔ کچھ
معلومات امین نامی شخص نے فراہم کیں لیکن زیادہ تر چاند سے ہی حاصل ہوئیں۔ اس نے
اپنے مخصوص انداز میں چسکا لے لے کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

زبیدہ اور صلو کافی عرصے ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار رہے۔ ایک دو موقعوں
پر چاند نے خود بھی انہیں امردوں کے باغ سے آگے پیچھے نکلتے دیکھا تھا۔ ان کی محبت کا
چرچا زیادہ نہیں ہوا تھا، پھر بھی سمجھ دار لوگوں کو پتا تھا کہ دال میں کالا ہے۔ زبیدہ اور صلو کی
آپس میں کوئی رشتے داری نہیں تھی۔ بہرحال ذات ایک ہی تھی۔ صلو کا باپ اس رشتے پر

راضی نہیں تھا۔ اس نے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا اور بالآخر زبیدہ کی شادی بشیرے (مرحوم) سے ہوگئی۔ اس غم ناک واقعے کے بعد صلاح الدین عرف صلو کچھ عرصہ بیمار بھی رہا تھا۔ وہ بے حد کمزور ہوگیا تھا پھر دو چار ماہ بعد ٹھیک تو ہوگیا لیکن کہا جاتا ہے کہ اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب بھی وہ نشے کا عادی تھا۔ وہ اکثر چپ چاپ اور الگ تھلگ رہتا تھا۔ ماں باپ کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد اس کی شادی ہو جائے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ گرہستی میں مشغول ہو کر وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں تک تو صلو کے بزرگوں کی سوچ شاید درست ہی تھی لیکن صلو کی شادی کے لیے انہوں نے جو لڑکی ڈھونڈی تھی وہ صلو کے جوڑ کی نہیں تھی۔ وہ صلو کی چچازاد تھی اور اسے صرف اس لیے صلو کی بیوی بنایا جا رہا تھا کہ ان کے بڑے اپنی خاندانی زمین کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ یہ زمین بہت زیادہ تو نہیں تھی، لیکن جتنی بھی تھی بڑوں کے لیے اہم تھی۔ شاید دو تین ایکڑ کا معاملہ تھا۔

شوکت کو اب تفتیش آگے بڑھتے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ جب اسے کسی معاملے میں کامیابی کی امید نظر آتی تو اس کی آنکھیں ہمیشہ سے زیادہ روشن ہو جاتی تھیں۔

چاند کے جانے کے بعد اس نے سگریٹ سلگا کر اپنے دونوں پاؤں میز پر رکھے اور کرسی پر نیچے کو کھسکتے ہوئے بولا۔ ''ہاں جی صحافی صاحب! اب کیا کہتا ہے آپ کا ذہن اس بارے میں؟''

میں نے کہا۔ ''یار! میں تو یہاں آیا تھا گاؤں کی خوب صورتیاں دیکھنے کے لیے، تم نے مجھے خون خرابے کے چکروں میں پھنسا دیا ہے۔''

''ویسے بائی داوے..... خوب صورتیوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''جو مطلب تم نکالنے کی کوشش کر رہے ہو، وہ میرے ذہن میں موجود نہیں ہے، میں درختوں، پرندوں اور کھیتوں کی بات کر رہا ہوں۔''

''ویسے تمہاری بھابی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ وہ اکثر میرے پیچھے پڑی رہتی ہے کہ اسلم کی شادی کرا دو اور اگر وہ نہیں مانتا تو اسے کسی بہانے ہتھکڑی لگا کر اس کے سر پر سہرا باندھ دو۔''

''میں نے ہمیشہ بھابی کی عزت کی ہے، پھر پتا نہیں کیوں وہ مجھے عزت داروں میں نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''اچھا اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ زبیدہ اور صلو والے معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے۔''

میں نے بھی نیا سگریٹ سلگایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ذرا نیچے کو کھسک گیا۔ ہم تھانے میں تھے اور یہ شوکت یعنی ایس ایچ او کا کمرا تھا۔ کھڑکی میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی سے آگے برآمدہ تھا اور برآمدے سے آگے گاؤں کی گلیوں میں سرد کالی رات سنسنا رہی تھی۔ اس سنسناہٹ میں آوارہ کتوں کی آوازیں تھیں یا کہیں دور سے میواتی چوکیدار کی بھرائی ہوئی آواز آتی تھی ''جاگدے رہنا...... بھائیو! جاگدے رہنا۔''

رات کے سناٹے میں چوکیدار کی آواز ہمیشہ اندیشے اور خطرے کو اجاگر کرتی ہے۔ آج یہ آواز کچھ زیادہ ہی پُراندیش محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا سبب، اوپر تلے ہونے والے وہ دو واقعات تھے جنہوں نے باغ پور کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ بلکہ شاید باغ پور کے ساتھ ساتھ اس پورے علاقے کو ہلچل سے دوچار کیا تھا۔

شوکت کے سوال کا جواب سنجیدگی سے دیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''واقعات کی کڑیاں جوڑیں تو کہانی کچھ یوں بنتی نظر آتی ہے..... صلو طویل عرصے سے زبیدہ کے عشق میں گرفتار تھا۔ شومئی قسمت زبیدہ کی شادی بشیرے سے ہوگئی لیکن صلو اور زبیدہ نے پھر بھی چوری چھپے ملنا جاری رکھا۔ دوری نے ان کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو مزید بھڑکایا۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹیں دور کر دیں۔ بڑی رکاوٹیں تو دو ہی تھیں یعنی بشیرا اور صغراں۔ اب کہانی کچھ اس طرح ہو سکتی ہے۔ بشیرے کے قتل کی رات زبیدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھانے پہنچی ہو۔ اس نے ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ یہ گمراہ کرنے کی کوشش بھی تو ہو سکتی ہے کہ اس نے ہمیں اپنے گھر کے صحن میں ایک ناقابلِ فہم سائے کی موجودگی کی اطلاع دی۔ یعنی اس نے ہمیں باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کے گھر میں کوئی خطرناک شے موجود ہے۔ اپنی دیہاتی سمجھ بوجھ کے مطابق اس نے یہی خیال کیا تھا کہ تھانے والے اور گاؤں والے اس کی باتوں پر یقین کریں گے۔ اپنے

طور پر اس نے تفتیش کو بھٹکانے کے لیے زمین ہموار کی۔ عین ممکن ہے کہ جب وہ تھانے میں ہمارے سامنے واویلا کر رہی تھی صلو کہیں آس پاس موجود ہو اور بشیرے کو قتل کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔ بعد ازاں جب سارا ہنگامہ سرد ہو گیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ گھر میں بشیرا، زبیدہ اور اس کا بچہ رہ گئے۔ زبیدہ نے باہر کا دروازہ کھول کر صلو کو اندر بلا لیا اور اس کے ہاتھوں شوہر نامدار کا ''گل گھوٹو'' کروا دیا۔ یہاں ہمارے ذہن میں ایک سوال اٹھ سکتا ہے۔ دونوں کھوجیوں کی تحقیق اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قاتل چھوٹے قد کا ایک چوڑا چکلا شخص تھا۔ صلو اس حلیے پر پورا نہیں اترتا...... لیکن ہمیں یہ امکان نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ صلو قتل کی یہ واردات کسی کرائے کے بندے سے بھی کرا سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس حوالے سے اس نے اپنے کسی یار دوست کی مدد لی ہو۔ صلو جیسے لوگ ایسے کاموں کے لیے اکثر کسی کا سہارا لیتے ہیں۔''

میرے اور شوکت کے درمیان اس موضوع پر تادیر گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے روز علی الصباح شوکت نے صلو کو شاملِ تفتیش کر لیا۔ اس کے علاوہ زبیدہ کو بھی پولیس اسٹیشن بلا لیا گیا۔ وہ اپنے عمر رسیدہ والد کے ساتھ آئی۔ پولیس عام طور پر ملزمان کے علیحدہ علیحدہ انٹرویو کر کے ان کے بیانات میں تضاد ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہے۔ پرانے وقتوں میں بھی یہ طریقہ رائج تھا۔ خاص طور سے دیہات میں اس کی پریکٹس عام تھی۔ تفتیشی افسر اس طریقۂ کار کے مطابق ایک ہی جرم میں ملوث افراد کو علیحدہ علیحدہ اپنے کمرے میں بلاتا ہے۔ ان سے سوال جواب کرتا ہے اور ہر ایک کو یہ کہہ کر چکما دینے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ اس کے ساتھی نے یا ساتھیوں نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔

شوکت نے پہلے صلو کو کمرے میں بلایا۔ میرے علاوہ اے ایس آئی نذیر بھی موجود تھا۔ حسبِ رواج شوکت نے پہلے تو صلو کو ڈرایا دھمکایا اور اسے چمڑے کے لمبوترے چھتر کی جھلکی دکھائی۔ صلو کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اس کے بعد شوکت نے قدرے نرم رویہ اختیار کیا اور صلو سے کہا کہ وہ تفتیش میں تعاون کرے تو شدید قسم کی سختی سے بچ سکتا ہے۔ جواب میں صلو نے لرزاں لہجے میں جو کچھ بتایا وہ اس طرح تھا۔ صلو نے تسلیم کیا کہ کچھ عرصہ پہلے وہ زبیدہ سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کر کے گھر بسانا چاہتا تھا لیکن چونکہ زبیدہ کا

والد اس رشتے پر راضی نہیں تھا اس لیے شدید خواہش کے باوجود زبیدہ کو اپنا نہ سکا۔ کچھ عرصے وہ بہت پریشان رہا اور بیمار بھی ہو گیا، لیکن دھیرے دھیرے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ صلو نے کہا کہ اب وہ زبیدہ کو بالکل بھلا چکا ہے۔ اسے بھول جانا ہی مناسب تھا۔ وہ کسی کی بہو ہے، کسی کے بچے کی ماں ہے۔ وہ اس سے خفیہ ملاقاتوں کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

صلو سے سوال جواب ہو چکے تو زبیدہ کی باری آئی۔ شوکت نے اس کے بوڑھے باپ کو تسلی تشفی دے کر کمرے سے باہر بٹھا دیا۔ قتل والے واقعے کے بعد میں زبیدہ کو آج دیکھ رہا تھا۔ آج وہ بے تحاشا خوف زدہ نہیں تھی اور نہ ہی رو دھو رہی تھی۔ آج اس کے نقوش اصلی حالت میں نظر آ رہے تھے۔ وہ خوب صورت تھی۔ اگر سوگوار نہ ہوتی تو شاید زیادہ خوب صورت نظر آتی۔ اس نے اپنے سر کی اوڑھنی کو مضبوطی سے ٹھوڑی کے نیچے تھام رکھا تھا۔

شوکت نے اس سے بھی صلو جیسا سلوک ہی کیا۔ پہلے سخت لہجے میں بات کی پھر تھوڑا سا نرم ہوا۔ زبیدہ نے جو بیان دیا وہ کافی حد تک صلو کے بیان سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تھانے دار صیب! میں اس بات سے انکار نہیں کرتی کہ تین چار سال پہلے صلو مجھ سے بیاہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ سب تو پرانی باتیں ہیں جی۔ اب تو میری شادی ہو چکی تھی۔ میرے سرداسائیں ہی میرا سب کچھ تھا۔ میں کوئی بری عورت نہیں ہوں جی۔ اللہ معاف کرے۔ میں اپنے سردے سائیں کو دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، میرے بس میں ہوتا جی...... تو میں اپنی جان دے کر بھی اپنے بچے کے باپ کو بچا لیتی۔''

وہ اشک بار تھی۔ شوکت نے اس سے زیادہ باز پُرس مناسب نہیں سمجھی۔ صرف چند روز پہلے اس کا شوہر قتل ہوا تھا۔ اگر اس قتل میں زبیدہ کا ہاتھ نہیں تھا تو پھر وہ واقعی قابلِ رحم تھی۔ ایسے میں اگر اسے شک کی نظروں سے دیکھا جاتا اور پوچھ گچھ میں سختی کی جاتی تو یہ نہایت نامناسب تھا۔ یہ رویہ اس کے زخموں پر نمک پاشی کر سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''زبیدہ بی بی! تم بشیرے کے قتل کے سلسلے میں کسی پر شک کر سکتی ہو؟''

وہ بے ساختہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ ''میں کچھ نہیں کہہ سکتی جناب! میں کس پر انگلی اٹھاؤں۔ اللہ بخشے وہ تو سیدھا سادا بندہ تھا، اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ کسی سے دشمنی

نہیں تھی اس کی۔''

''لیکن کسی کو تو اس سے دشمنی ہو سکتی تھی نا...... میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو۔'' شوکت نے کہا۔

وہ سوالیہ نظروں سے شوکت کا چہرہ دیکھتی رہی۔ شوکت بولا۔ ''چلو ہم تیری بات مان لیتے ہیں کہ اب صلو سے تیرا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا مگر صلو کے دل میں کیا چھپا تھا، اس کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ یہ دونوں قتل صلو نے کیے ہوں یا کرائے ہوں۔ تم تک پہنچنے کے لیے اس نے اپنے رستے کی دونوں رکاوٹیں دور کر دی ہوں۔''

''دلوں کے بھید تو اللہ جانتا ہے تھانے دار صیب...... لیکن صلو ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے پورا یقین ہے۔''

''لگتا ہے کہ صلو کو بڑا قریب سے جانتی ہو۔'' شوکت کے لہجے میں طنز تھا۔

وہ گڑبڑا گئی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

اگلے روز دوپہر کو جواں مرگ صغراں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ اس رپورٹ نے معاملے کو کچھ اور الجھا دیا۔ پولیس سرجن کی یہ مفصل رپورٹ شوکت نے مجھے بھی دکھائی۔ اس پر کیمیکل ایگزامنر کے ریمارکس بھی تھے۔ رپورٹ میں یہ بات واضح طور پر لکھی گئی تھی کہ متوفیہ کی موت دم گھٹنے سے ہوئی ہے۔ گردن کے ٹشوز پر گہرے دباؤ کے نشانات پائے گئے ہیں اور غالب امکان ہے کہ اسے گردن دبا کر ہلاک کیا گیا ہے۔ جسم پر کئی خراشیں ہیں۔ کچھ ہلکی ہیں اور کچھ گہری۔ جنسی اعضا کے نزدیک بھی ایسی خراشیں موجود ہیں لیکن معائنے میں یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ متوفیہ کی عزت لوٹی گئی ہے۔

اس رپورٹ میں ایک بہت خاص بات بھی تھی اور یہی وہ بات تھی جو اس واقعے کو اور اس سارے معاملے کو بہت الجھا دیتی تھی۔ متوفیہ کے لباس اور گردن کے پاس سے کچھ بال برآمد ہوئے تھے۔ اگر اس واقعے کو قتل تسلیم کر لیا جائے تو یہ بال مقتولہ کے نہیں تھے اور نہ ہی قاتل کے تھے۔ یہ بال کسی انسان کے لگتے ہی نہیں تھے۔ یہ بال کسی حد تک بھورے رنگ کے تھے اور چار انچ کے قریب لمبے تھے۔ مقتولہ کے جسم اور لباس سے یہ غیر مانوس

بال ساٹھ ستر کی تعداد میں برآمد ہوئے تھے۔ ان بالوں کے بارے میں ابھی مزید تحقیق جاری تھی۔

رپورٹ میں موجود مندرجہ بالا پیراگراف نے اس ساری رپورٹ کو سنسنی خیز بنا دیا تھا۔ یہ پیراگراف ڈرامائی رنگ لیے ہوئے تھا اور اس میں اسراریت جھلکتی تھی۔

یہ سطور پڑھنے کے بعد شوکت نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، میں بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میری نگاہوں میں چند روز پہلے کا منظر گھوم گیا۔ وہی سرد کالی رات...... جب ہم دہکی ہوئی انگیٹھی کے سامنے بیٹھے مونگ پھلی ٹھکور رہے تھے۔ زبیدہ بھاگتی ہوئی تھانے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ دہشت سے زرد ہو رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی...... میرے پیچھے بلا آ رہی ہے...... میرے پیچھے بلا آ رہی ہے۔

☆=====☆=====☆

دیہات کی سردی شہر کی سردی سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ کسی گاؤں کا درجۂ حرارت نزدیکی شہر کے درجۂ حرات سے کہیں کم ہوتا ہے۔ ہریالی اور کھلی آب و ہوا کی وجہ سے در و دیوار پر کہرا جم جاتا ہے اور تالابوں و جوہڑوں کی بالائی سطح پر برف کی تہہ عام دیکھی جاتی ہے۔ یہ ہڈیوں میں سرایت کرتی ہوئی اور گودے کو جماتی ہوئی سردی ہوتی ہے لیکن اس سردی کا اپنا ایک لطف ہوتا ہے۔ خاص طور سے صبح کی تازہ ہوا میں گرم چادر کی ''بکل'' مار کر ٹہلنا اور پھول پتوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتی ہوئی ٹھنڈک دیکھنا ایک خوشگوار تجربہ ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ دھوپ مکانوں کی چھتوں سے اترتی ہے اور گلیوں تک پہنچتی ہے، ٹھٹھرے ہوئے لوگ بغلوں میں ہاتھ دیئے اس زرد کمزور دھوپ میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں اور شدت سے اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ یہ دھوپ تیز اور چمکیلی ہو جائے۔ جوں جوں دھوپ تیز ہوتی ہے، گاؤں کی مٹیالی گلیوں اور ہرے کھیتوں میں زندگی کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔

اس روز میں اتفاقاً جلدی بیدار ہو گیا۔ اندھیرا ابھی گہرا تھا۔ در و دیوار کا اصل مٹیالا رنگ ابھی نظر آنا شروع نہیں ہوا تھا۔ شوکت رات کو تھانے میں دیر تک رکا رہا تھا۔ اب وہ

بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور اکیلا ہی کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ میرے کندھوں پر گرم چادر تھی۔ چہرے کو سردی سے بچانے کے لیے میں نے مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ کل والے واقعات وقتی طور پر ذہن سے محو ہو چکے تھے۔ میں بھیگے ہوئے گرد وپیش سے لطف اٹھاتا، کیکر کی مسواک کرتا گاؤں سے باہر جانے والی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ گاؤں سے قریباً دو فرلانگ باہر ایک کنواں تھا۔ میرا رخ کنویں کی جانب تھا۔ اچانک کھیت کی دوسری جانب سے تیز سرسراہٹ کی آواز آئی، یوں لگا جیسے کوئی فصل کے درمیان تیزی سے بھاگا ہے۔ یہ کماد کی خاصی اونچی فصل تھی۔ پہلے تو مجھے یہی لگا کہ کوئی جانور غالباً کتا وغیرہ دوڑ رہا ہے لیکن پھر فوراً ہی دھپ کی آواز آئی۔ ایسی آواز کسی انسان کے کچی زمین پر گرنے سے ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ میرے ذہن میں خطرہ کی گھنٹی زور وشور سے بجنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی دہرے قتل کے واقعات اپنے تمام اسرار کے ساتھ ذہن میں تازہ ہو گئے۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس کوئی شے نہیں تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ شوکت کے بغیر میں نے یوں صبح سویرے نکل کر اچھا نہیں کیا۔ ایک دہشت زدہ چیخ رات کے سناٹے میں ابھری اور میرے بدن میں سنسنی کی تیز لہریں دوڑ گئیں۔ یکا یک ذہن خوفناک خدشات کی آماجگاہ بن گیا۔ میں نے چند سیکنڈ کے اندر حوصلہ جمع کیا پھر تیزی سے آواز کی سمت گیا۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ ابھی میں چند قدم ہی گیا تھا کہ نامعلوم عورت دہشت سے پھٹی ہوئی آواز میں دوبارہ چیخی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ عورت اوندھے منہ گری پڑی ہے اور مدد کے لیے پکار رہی ہے لیکن ایک خاص بات میں نے مزید نوٹ کی۔ عورت پنجابی یا اردو کے بجائے کسی اور زبان میں پکار رہی تھی۔ میں اوس سے بھیگے اور ٹھٹھرے ہوئے پودوں کے درمیان راستہ بناتا عورت کی طرف بڑھا۔ دل سینے میں بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ تب وہ مجھے چند گز کے فاصلے پر نظر آئی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ چکی ہے۔ وہ آگے بڑھی اور بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا لرزتا ہوا گرم، گداز جسم بڑی بے باکی کے ساتھ مجھ سے پیوست ہو گیا تھا۔ میں اس اچانک افتاد سے پوری طرح سنبھلا نہیں تھا کہ عورت کا تعاقب کرتی ہوئی سرسراہٹ تیز ہو گئی۔

''HELP ME......HELP ME'' لڑکی اپنے عقب میں دیکھتے ہوئے چیخی اور مجھے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے خود کو اس سے جدا کیا اور آنے والی مصیبت کے لیے تیار ہو گیا۔

دو سیکنڈ جو بہت طویل تھے، مزید گزرے اور پھر گنوں کے عقب سے ایک ہیولا نمودار ہوا۔ نیم تاریکی میں اس کی شکل صاف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ درمیانے قد کا شخص تھا۔ اس کی آنکھیں چمکیلی اور روشن تھیں۔

ایک عمر رسیدہ لیکن جانی پہچانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''اسلم بیٹا! یہ تم ہو؟''

میں نے ذرا دھیان سے دیکھا، میرے سامنے بابا صادق کھڑا تھا۔ بابے صادق کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ بابا صادق باغ پور گاؤں کا ایک دلچسپ کردار تھا۔ عمر اسّی سال سے کم نہیں تھی۔ کچھ لوگ مبالغہ کرتے ہوئے بتاتے تھے کہ وہ سو سال کے قریب ہے۔ اگر اس کا سرخ وسپید چہرہ اور اچھی خاصی صحت دیکھی جاتی تو وہ ساٹھ ستر کا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں چمکیلی تھیں اور چہرے پر ہمہ وقت ایک چالاک سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ بابے صادق کے تقریباً سارے دانت جھڑ چکے تھے۔ تاہم، بصارت اور سماعت قائم ودائم تھی۔ وہ خوب مزے کی باتیں کرتا تھا۔ اپنی جوانی کے گرما گرم قصے بلا جھجک سناتا تھا۔ خود بھی لطف اندوز ہوتا تھا اور دوسروں کو بھی کرتا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے جب میں باغ پور آیا تھا تو بابے صادق سے جان پہچان کا آغاز ہوا تھا۔

بابا صادق اور میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ نامعلوم عورت یا لڑکی میرے پیچھے تھی۔ اسی دوران میں، میں نے چند آوازیں اور سنیں۔ ان میں سے ایک آواز میں نے واضح طور پر شناخت کر لی۔ یہ باغ پور کے سرکردہ زمیندار چوہدری ارباب کے بڑے بیٹے کی آواز تھی۔ پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں بالکل قریب پہنچ گئیں۔ یہ کل تین بندے تھے۔ دو کے ہاتھوں میں ٹارچیں اور پستول تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پیتل کی ناموں والی چمکتی ہوئی لاٹھی تھی۔

''کیا ہوا سلویا؟'' ٹارچ اور پستول والے ایک لمبے تڑنگے شخص نے انگریزی میں

پوچھا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی روشنی اب سلویا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک خوش نما لڑکی تھی۔ اس نے براؤن جرسی اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔ وہ شکل سے یورپین نظر آتی تھی۔ کچی زمین پر اوندھے منہ گرنے سے اس کی جرسی سامنے سے کیچڑ آلود ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک سہمی ہوئی میرے عقب میں کھڑی تھی۔ لمبے تڑنگے انگریز نے پھر پوچھا۔ ''بتاتی کیوں نہیں ہو سلویا؟''

سلویا نے خوف زدہ انداز میں بابے صادق کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ہی تیز لہجے میں کچھ کہا۔

زمین دار چوہدری ارباب کا بیٹا عالمگیر زور سے ہنسا۔ اس کے قہقہے نے ایک دم فضا کے تناؤ کو کم کر دیا۔ عالمگیر بولا۔ ''میم صاحب! یہ تو اپنا ملازم بابا صادق ہے۔ اس سے ڈرنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

''لیکن یہ ہام کو پکڑنے کے واسطے، ہمارے پیچھے بھاگا۔ یہ ہام کو ایک دم ڈینجر لگا۔''

بابا صادق جو ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا، اب کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔ ''چوہدری جی! گلتی کی معافی چاہتا ہوں۔ لل...... لیکن یہ میم صیب چوروں کی طرح شٹالے (چارے) کے کھیت میں چھپی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھ لیا اس کے بعد......''

''اس کے بعد اس اولڈ مین نے ہام پر جمپ کیا اور ہام کو نیچے گرا دیا۔ یہ ہمارے اوپر آ گیا۔ اس نے ہام کو اتنی زور سے رگڑا دیا کہ ہمارا سارا بازو چھل گیا۔'' وہ براؤن جرسی کے نیچے اپنی کہنیاں سہلاتے ہوئے بولی۔

خوب رو انگریز لڑکی کی جرسی اور پتلون مٹی سے لتھڑی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ باغ پور کے توانا بوڑھے نے میم صیب کو واقعی ٹھیک ٹھاک رگڑ دیے ہیں۔ تاریکی میں بابے کو پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کس سے کشتی میں مصروف ہے۔

میں ابھی تک حیرانی میں تھا۔ میری نظر کبھی چوہدری کے بیٹے عالمگیر کی طرف اٹھ

تھی اور کبھی ٹارچ بردار غیر ملکیوں کی طرف۔ سلویا نامی لڑکی سمیت یہ کُل چار افراد تھے۔ انہوں نے جینز اور جوگر وغیرہ پہن رکھے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ چوہدری عالمگیر کے مہمان ہیں...... اور غالباً سیر و شکار کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی بہ آسانی آ رہی تھی کہ سلویا اتنی بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے لپٹ کیوں گئی تھی۔ دراصل وہ بابے صادق سے ڈر کر بھاگی تھی۔ نیم تاریکی میں اس نے مجھے اپنا ساتھی سمجھا تھا اور اپنے توبہ شکن جسم کی ''تباہ کاری'' کی پروا کیے بغیر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اب وہ تھوڑی سی شرمندہ بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے سرخ و سپید ہاتھ سے، میرے کپڑوں پر لگنے والی مٹی جھاڑی اور بولی۔ ''ویری ساری مسٹر......''

میرے بجائے بابا صادق بولا۔ ''کوئی بات نہیں...... کوئی بات نہیں میم جی...... بندہ بشر گلتی کھا جاتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی بابے صادق نے بڑی محبت کے ساتھ میم جی کی پتلون جھاڑنا شروع کر دی۔

عالمگیر کے ساتھ ہم سب کنویں پر آ گئے۔ اب اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ کنویں سے نکلنے والا پانی کھالوں میں پھیل رہا تھا اور سردی کے سبب ہلکا ہلکا دھواں دے رہا تھا۔ ایک چھپر تلے اُپلوں کی آگ جل رہی تھی اور ایک بڑی چارپائی کے علاوہ چار پانچ موڑھے بھی پڑے تھے۔ عالمگیر گھنی مونچھوں اور چمکیلے بالوں والا ایک نوجوان چوہدری تھا۔ بعض لوگ اسے چھوٹا چوہدری بھی کہتے تھے۔ عالمگیر نے غیر ملکیوں کے علاوہ مجھے بھی احترام سے بٹھایا۔ عالمگیر کو معلوم تھا کہ میں انسپکٹر شوکت کے قریبی دوست کی حیثیت سے یہاں موجود ہوں۔ اس نے پنجابی میں بات کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''اسلم صاحب! یہ لوگ ولایت سے آئے ہیں۔ تحصیل دار صاحب کے خاص مہمان ہیں۔ یہ علاقے میں شکار وغیرہ کرنا چاہتے ہیں۔ تحصیل دار صاحب نے انہیں ابا جی کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ میں شکار کے سات آٹھ پرمٹ بھی بھیج دیے ہیں۔ یہ لوگ اب آٹھ دس روز یہیں رہیں گے۔''

عالمگیر نے مزید تفصیلات بھی بتائیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ رات کو کونج کے شکار کا پروگرام بنایا گیا تھا (یہ شکار عموماً رات کو ہی کیا جاتا ہے، کیونکہ کونج رات کو ہی آتی ہے)

شکار کے سلسلے میں ہی یہ سب لوگ کھیتوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ایک زخمی کونج کو پکڑنے کے لیے سب بھاگ کھڑے ہوئے لیکن سلویا چونکہ تھکی ہوئی تھی اس لیے وہیں بیٹھی رہی۔

اسی دوران میں بابا صادق جو کنویں کے پاس کٹی ہوئی فصل کی رکھوالی کے لئے بیٹھا تھا، پیشاب کرنے کھیتوں کی طرف آ گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ سلویا یہاں کماد میں موجود ہے۔ اس نے سلویا کو مشکوک سمجھ کر اسے للکارا اور پکڑنے کے لیے بڑھا۔ سلویا ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بابے صادق کی ٹانگوں میں جوانوں جیسی پھرتی تھی، اس نے کچھ آگے جا کر سلویا کو دبوچ لیا اور جوش میں اسے اچھا خاصا رگیدا۔

میں نے انگریزوں سے بھی گفتگو کی۔ ان میں سے جیکب اور ہارڈی دو بھائی تھے۔ شکار کے علاوہ فٹ بال کے بھی زبردست شوقین تھے۔ تیسرا اسمتھ تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح یہ بھی جواں سال تھا۔ لندن میں یہ ایک موٹر ورکشاپ چلاتا تھا۔ سلویا دونوں بھائیوں یعنی جیک اور ہارڈی کی قریبی عزیز تھی۔ دوسرے لفظوں میں کزن تھی۔ وہ برمنگھم کے رہنے والے تھے۔

یہ چار افراد بہ ظاہر خوش اخلاق تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میرا تعلق صحافت سے ہے تو وہ میری گفتگو میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ ان کی بات چیت سے مجھے یاد آیا کہ مغربی معاشرے میں صحافیوں، قلمکاروں اور ادب و فن سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو خصوصی توقیر دی جاتی ہے۔ ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ اس دوران میں عالمگیر لاتعلق بیٹھا رہا کیونکہ وہ انگریزی سے نابلد تھا۔ سلویا کے علاوہ اس کے دو ساتھی تھوڑی بہت اردو بول لیتے تھے۔ وہ تینوں کئی مرتبہ یہاں آ چکے تھے اور ایک موقع پر انہوں نے کافی عرصہ شملہ میں بھی قیام کیا تھا۔ ہماری گفتگو میں ان دونوں اندوہ ناک واقعات کی بازگشت بھی سنائی دی جو اوپر تلے باغ پور میں ہو چکے تھے۔

جب میں عالمگیر اور اس کے مہمانوں سے رخصت ہو کر گاؤں واپس پہنچا تو سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ رات بھر کے ٹھٹھرے ہوئے جانور انگڑائیاں لے رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی زندگی بھی انگڑائیاں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ گلیوں میں مرغیاں پھدکنے لگی تھیں اور مویشی اپنے گلے میں بندھی گھنٹیوں سے موسیقی جگاتے کھیتوں کھلیانوں کا رخ کر رہے

تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ عالمگیر اور اس کے غیر ملکی مہمانوں سے مل کر میں الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ بہ ظاہر اس الجھن کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی چیز چھپائی جا رہی ہے۔ سب کچھ ویسا نہیں جیسا نظر آ رہا ہے۔ شاید یہ میری چھٹی حس تھی جو کسی اَن دیکھی علامت کو شک کا جواز بنا رہی تھی یا پھر شوکت کے ساتھ رہ رہ کر میں بھی ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔

بہرحال کچھ بھی تھا ایک بات غور طلب تھی۔ باغ پور کا یہ گاؤں، شکار کے معروف علاقے سے قریباً پندرہ بیس میل شمال کی طرف تھا۔ یہاں شکار ملتا تو تھا لیکن اتنا نہیں تھا کہ کچھ لوگ دور دراز سے چل کر صرف شکار کے لیے باغ پور میں آ ٹھہریں۔ جہاں تک میرا علم تھا باغ پور میں شاذونادر ہی کوئی شکاری صرف شکار کی نیت سے آ کر ٹھہرا ہوگا۔ یہ بات خود بہ خود ذہن میں آئی تھی کہ اگر یہ غیر ملکی شکار کا صحیح لطف اٹھانا چاہتے تھے تو پھر انہیں جنوبی دیہات رحمت پور اور روہو والی وغیرہ کی طرف جانا چاہیے تھا۔ میں انہی پہلوؤں پر سوچتا ہوا گھر پہنچ گیا، یہاں شوکت شدت سے ناشتے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔

''اوئے اسلم! تیری مصروفیات کچھ مشکوک ہوتی جا رہی ہیں۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' شوکت نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''تیرا خیال ہے کہ میں نے گاؤں کی کوئی مٹیار تاڑ لی ہے...... اور اسی مٹیار کی وجہ سے تیری نوکری خطرے میں پڑنے والی ہے۔'' میں نے حتمی نتیجہ نکالتے ہوئے کہا۔

''اوئے تجھ پر ایسی درجنوں نوکریاں قربان...... لیکن میں جانتا ہوں تُو خود کچھ نہیں کرے گا، تیرے لیے ہمیں ہی کوئی ڈھونڈنا پڑے گی۔ ویسے بائی دی وے۔ گیا کہاں تھا؟''

میں ناشتا کرنے لگا اور ساتھ شوکت کو صبح سویرے پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ یہ ایک اہم واقعہ تھا۔ شوکت پوری توجہ سے سنتا رہا اور بیچ میں سوالات بھی پوچھتا رہا۔ اسے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ چوہدری ارباب کے گھر کوئی غیر ملکی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ہم چوہدری ارباب کے بارے میں بات کرنے لگے۔ وہ ایک روایتی چوہدری

تھا۔ خوش اخلاق اور زندہ دل بھی تھا لیکن کچھ معاملوں میں سخت اور انا پرست بھی لگتا تھا۔
پچھلی دفعہ جب میں باغ پور آیا تھا تو چوہدری ارباب سے ملاقات ہوئی تھی۔ کبڈی کے
ایک میچ میں چوہدری ارباب نے انعامات تقسیم کیے تھے۔ میں بھی اسی میچ میں تماشائی کی
حیثیت سے موجود تھا۔ چوہدری ارباب کے ہاں اکثر سرکاری افسران آتے رہتے تھے۔
تحصیل دار فیروز علی ٹوانہ سے بھی چوہدری کا دوستانہ تھا۔ علی الصباح جو واقعہ پیش آیا تھا وہ
عجیب ضرور تھا لیکن شوکت کے خیال میں ناممکن نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا کہ تحصیل دار نے ان
مہمانوں کو شکار اور سیاحت کے لیے ہی باغ پور بھیجا ہو۔

اس دن کا آغاز ایک دلچسپ واقعے سے ہوا تھا لیکن اختتام ایک سنگین واقعے پر
ہوا۔ اس دن سردی معمول سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ سرِ شام دھند سی پڑنا شروع ہوگئی۔
لوگ گھروں میں دبک گئے اور جو زیادہ ٹھٹھرے ہوئے تھے وہ لحافوں میں دبک گئے۔
شوکت کے ملازموں نے انگیٹھی دہکا رکھی تھی۔ انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر گپیں ہانکنے کے
لیے اس نے ریوڑیوں اور مونگ پھلی کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ خیال تھا کہ چاند صاحب بھی
ماسٹر نوردین کو لے کر آجائیں گے اور دیر تک محفل جمے گی لیکن کسی وجہ سے چاند اور ماسٹر
نوردین نہ آسکے۔ ویسے بھی شوکت کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ وہ کھانے کے کچھ دیر
بعد ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں انگیٹھی کے سرخ انگاروں کے سامنے دیوار سے ٹیک
لگائے بیٹھا رہا اور ریڈیو سنتا رہا۔ دور دراز دیہاتی علاقوں میں آج بھی ریڈیو "باخبر" رہنے
کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس وقت تو خاص طور سے ریڈیو کی بے حد اہمیت تھی۔ بعض سادہ
لوح لوگ تو اس بولتے "ڈبے" کو جادو کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ ریڈیو سنتے سنتے ہی مجھے بھی
اونگھ آگئی۔

نہ جانے میں کتنی دیر اس کیفیت میں رہا۔ دوبارہ ایک آہٹ کی وجہ سے جاگا۔
انگیٹھی میں موجود سرخ انگاروں کا تین چوتھائی حصہ راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ لالٹین
روشن تھی اور میرا سایہ کمرے کی کچی دیوار پر لرز رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔
دروازے کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہوا چلنا شروع ہوگئی ہے۔ دروازے کا ایک پٹ ہولے
ہولے ہل رہا تھا۔ میں نے لحاف گھٹنوں پر سے ہٹایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں چاہ رہا تھا کہ

دروازہ بند کردوں اور لالٹین بجھا دوں اس کے بعد تکیہ سیدھا کروں اور لحاف اوڑھ کر سو
جاؤں لیکن عین اس وقت جب میں دروازے کے پاس پہنچا مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اور
شوکت کے علاوہ بھی کوئی اس گھر میں موجود ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا
کہ شوکت کو جگاؤں لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کردیا وہ درد کی گولی کھا کر سویا تھا اور
گہری نیند میں تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ تاریک صحن کی طرف سے پھر ایک آہٹ
سنائی دی۔ اب میرا چونکنا لازم تھا۔ میں نے ذرا دیر کے لیے سوچا پھر دیوار سے لٹکے ہولسٹر
میں سے ریوالور نکال لیا، یہ شوکت کا ریوالور تھا۔ میں محتاط قدموں سے صحن کی طرف گیا۔
ایک کراہ سنائی دی۔ میری رگوں میں خون سنسنا گیا۔ ادھ کھلے دروازے میں سے لالٹین
کی روشنی باہر صحن تک پہنچ رہی تھی۔ اس روشنی کی وجہ سے صحن کی کچی زمین پر زرد جالے کی
تکون سی بنی تھی۔ میں نے اس تکون میں ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ ایک بندہ بیرونی
دروازے کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا بلکہ نیم دراز تھا۔ اس کا سارا چہرہ خون
سے رنگین تھا اور اس چمکیلی سرخی کے اندر حرکت کرتی ہوئی اس کی سفید آنکھیں بہت
خوفناک لگ رہی تھیں۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے پھر میرے دل میں آیا
کہ شوکت کو بیدار کردوں۔ اس سے پہلے کہ میں واپس مڑتا۔ اجنبی کے ہونٹوں سے آواز
نکلی۔ اس نے کچھ کہا مگر میں سن نہیں سکا۔

میں زخمی کو بہ غور دیکھنے کے لیے چند قدم آگے گیا۔ ریوالور پر میری انگلیوں کی
گرفت مضبوط تھی اور ذہن ماضی قریب کے واقعات کی وجہ سے بہت الرٹ تھا۔ میں نے
آگے جھک کر دھیان سے دیکھا اور اچانک میں نے زخمی کو پہچان لیا۔ یہ چاند تھا۔ چاند کا
پھول دار سویٹر جو چند دن پہلے اس کی بیوی نے بڑے چاؤ سے بُنا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا۔
چاند ہر سانس کے ساتھ کراہتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "چاند
بھائی۔ کیا ہوا......؟"

چاند نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ لالٹین کی
روشنی میں چاند کا نصف سر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سر پر گہرا زخم تھا۔ یہاں سے بہنے
والے خون نے چاند کے سانولے چہرے پر سرخ نقاب سی چڑھا رکھی تھی۔ یہی خون تھا

جواس کی گردن پر بہتا ہوا نیچے آیا تھا اور اس کے کرتے اور شلوار کو بھگو رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر چلا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا چاند؟''

چاند کے خون آلود ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

میری بلند آواز سن کر شوکت بھی جاگ گیا تھا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باہر صحن میں آ گیا۔ چاند کو پہچان کر اور اس کی حالت دیکھ کر شوکت بھی پریشان ہو گیا۔ ہم نے بھاری بھرکم چاند کی بغلوں میں ہاتھ دیے اور اسے سہارا دیتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔ شوکت نے لالٹین اٹھا کر چاند کے سر کے بالکل پاس کی۔ سر کا زخم کافی گہرا تھا۔ درحقیقت یہ زخم پیشانی سے ذرا اوپر آیا تھا۔ بہ ظاہر یہ کسی تیز دھار یا نوکیلی شے کی ضرب لگتی تھی۔ تاہم، ایک بات میرے ساتھ ساتھ شوکت نے بھی محسوس کی۔ چاند کے خاموش ہونے کی وجہ یہ زخم نہیں تھا۔ اس خاموشی کی نسبت، خوف سے تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نا قابلِ فہم ڈر جما ہوا تھا۔ ایک ایسی کیفیت جس نے اس پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

''خون اب بھی بہہ رہا ہے۔'' شوکت نے پریشان لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ چاند صاحب کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''کمپاؤنڈر رحمت سے کام چل جائے گا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''لیکن اسپتال جانے کے لیے تو گاڑی کی ضرورت ہو گی۔ جیپ بھی خراب پڑی ہے۔''

''میں نے آج شام چوہدری ارباب کی حویلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک سرخ کار دیکھی تھی۔ حویلی کے صحن میں کھڑی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ انہی انگریزوں کی ہے جن سے صبح ملاقات ہوئی۔'' میں نے کہا۔

شوکت کچھ کہے سنے بغیر باہر نکل گیا۔ وہ یقیناً چوہدری کی حویلی کی طرف گیا تھا۔ حویلی زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے چاند کو اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔ اس کا جسم مسلسل ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت اس قابل نہیں تھی کہ اس سے سوال جواب کیے جاتے۔

صرف آٹھ دس منٹ بعد گھر کے دروازے پر گاڑی کے انجن کی آواز ابھری پھر بیرونی دروازہ کھلا۔ انسپکٹر شوکت اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ چوہدری کا بیٹا عالمگیر بھی تھا۔ دو کارندے بھی ہمراہ تھے۔ چاند کو فوراً باہر کھڑی سرخ کار کی پچھلی نشست پر لٹایا گیا۔ اسے کار تک لانے سے پہلے میں نے اس کے زخم پر انگیٹھی کی راکھ ڈال کر مضبوطی سے پٹی باندھ دی تھی کچھ ہی دیر بعد سرخ کار تیزی سے تحصیل اسپتال کی طرف روانہ ہو رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں چاند کے زخمی ہونے کی خبر ارد گرد کی گلیوں میں پھیل گئی۔ لوگ یہاں کھڑے چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔

تحصیل اسپتال سے چاند کی واپسی رات ایک بجے کے قریب ہوئی۔ اس کے سر پر آٹھ ٹانکے لگے تھے۔ بڑی سی سفید پٹی نے اس کی نصف پیشانی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اب اس کی حالت کافی بہتر نظر آتی تھی۔ وہ نحیف آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ تاہم آنکھوں میں جما ہوا خوف ابھی تک جھلک دکھا رہا تھا۔ اس منجمد خوف کو دیکھ کر مجھے اپنے جسم میں بھی پھریری سی دوڑتی محسوس ہوتی تھی۔ دھیان خود بہ خود ان واقعات کی طرف چلا جاتا تھا جو کچھ روز پہلے باغ پور میں رونما ہو چکے تھے اور ابھی تک حل طلب تھے۔ بشیرے اور صغراں کے قتل کی تفتیش ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ صلو اور زبیدہ شاملِ تفتیش تھے اور ان سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں متوفیہ صغراں کے جسم پر جو بال پائے گئے تھے۔ وہ بھی تا حال معما بنے ہوئے تھے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد چاند نواز نے بند کمرے میں جو تفصیلی بیان دیا وہ نہایت سنسنی خیز تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ بیان میرے جیسے حقیقت پسند شخص کے لیے بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا تو غلط نہ ہو گا۔ اس بیان کے دوران میں مجھے ہر لحظہ یہی محسوس ہوا کہ چاند کا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا یا پھر وہ ہمیں بے وقوف بنانے کی بھونڈی کوشش کر رہا ہے۔ مگر یہ دونوں امکانات غلط تھے۔ چاند کے سر پر شدید چوٹ ضرور لگی تھی لیکن اب وہ مکمل ہوش و حواس میں تھا۔ وہ ہمیں بے وقوف بنانے کی جسارت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہی کچھ بیان کر رہا تھا جو اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔

یہ بیان وہم تھا یا حقیقت اور اگر حقیقت تھا تو کس حد تک حقیقت تھا اس پر بعد میں

بات ہو گی، پہلے آپ چاند کا بیان چاند ہی کی زبان سن لیجیے!

''شوکت صاحب، میں نو بجے کے قریب گھر سے روانہ ہوا۔ میں آپ کی طرف رہا تھا۔ دراصل آپ کی بھابی نے دال بنائی تھی (چاند میٹھی دال کا ذکر کر رہا تھا۔ پنجابی میں اسے بھانڈا بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے دیہاتی اور کچھ شہری بھائی بھی اس لفظ کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ یہ دیہات کی ہوم میڈ سویٹ ڈش ہوتی ہے۔ مختلف دالوں کو اچھی طرح پیس کر دیسی گھی میں بھون لیا جاتا ہے پھر اس میں چینی یا شکر ملائی جاتی ہے۔ یا دام، کشمش اور ناریل وغیرہ بھی بعض لوگ شامل کر لیتے ہیں۔ موسم سرما میں یہ نہایت مقوی غذا سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے کسان بھائی جو سردیوں میں صبح تڑکے کھیتوں کی طرف جاتے ہیں، اکثر اس دال کا ناشتا کرتے ہیں) میں ایک پتیلی میں گرم گرم دال ڈال کر آپ کی طرف لا رہا تھا۔ جب میں قبرستان کے پاس سے گزرا اچانک جنتر کی جھاڑیوں میں کھڑاک (کھٹکا) ہوا۔ میں نے سمجھا کوئی جانور ہے پر پھر ایک دم ایک پر چھانواں میرے سامنے آ گیا...... اس نے مجھے...... زور سے دھکا دیا...... مم...... میں اس کا دھکا کھا کر دور جا گرا۔ دال کی پتیلی ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی...... پپ...... پر چھانواں تیزی سے آگے آیا اور مجھ سے چمڑ (لپٹ) گیا۔'' یہاں تک کہہ کے چاند نے تھوک نگلا۔ اس کا چوڑا چکلا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور ہونٹ نیلے سے لگنے لگے تھے۔ وہ ہم دونوں کی طرف سراسیمہ نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''شوکت صاحب......! میں نے آپ کو رستے میں میں بھی دسیا (بتایا) تھا کہ آپ کو وہی کچھ بتا رہا ہوں جو کچھ میں نے اکھیوں سے دیکھیا ہے۔ مجھ کو آپ سے گلت (غلط) بیانی کرنے کی کوئی لوڑ (ضرورت) نہیں ہے......''

''چاند! ہمیں تم پر پورا یقین ہے۔'' شوکت نے کہا۔ ''ہم تمہاری بات پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔''

چاند نے ایک بار پھر تھوک نگلا اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ''شوکت صاحب اندھیرا ضرور تھا، پر میں صاف دیکھ رہا تھا۔ جو بندہ مجھ سے چمڑا (لپٹ گیا) تھا وہ کوئی انسان نہیں تھا۔ اس کے جسم کے اندر کسی جنگلی جناور جیسا زور تھا اور...... اس کی آنکھیں لال انگاروں کی طرح چمکارے مار رہی تھیں۔ شوکت صاحب...... میں قسم کھا کر

کہہ سکدا ہوں کہ اس کے دو نہیں بلکہ چار ہاتھ تھے اور اس کی ٹانگیں بھی دو سے زیادہ تھیں۔ میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھیا ہے، اس کے سر پر سینگوں کی طرح کی کوئی بڑی ہوئی شے تھی...... اور اس کا سر......'' چاند نے جھرجھری لی۔ ''اس کا سر جناب! مٹکے سے تھوڑا ہی چھوٹا ہوگا...... مجھے بالکل یہی لگا جیسا میں جاگدی (جاگتی) اکھیوں سے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہیا ہوں۔''

چاند کے ہونٹ گہرے نیلے ہو گئے اور ہاتھوں پیروں پر ایک بار پھر رعشہ سا طاری ہو گیا۔ اس واقعے کو دہراتے ہوئے اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی تھی جس سے وہ آج رات پہلے گزرا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے وہ سارا منظر پھر سے دیکھ رہی تھیں اور ان میں بہ تدریج ڈر جمع ہو رہا تھا۔ چاند کے چہرے کے تاثرات محسوس کر کے شوکت اور میں بھی ایک الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہو رہے تھے۔ بند کمرے سے باہر سرما کی طویل رات گاؤں کے کچے درو دیوار پر ٹھہری گئی تھی۔ سناٹے میں آوارہ کتوں کی دور افتادہ آوازوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چاند چند لمحوں تک جیسے اپنے حواس درست کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''شوکت صاحب...... اس کے جسم سے اتنی سخت بدبو آ رہی تھی کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ میں نے اندھا دھند اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا اور چیکاں (چیخیں) مارتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ منحوس پر چھانواں میرے پیچھے بھاگا۔ اس وقت میرے دماغ میں بس ایک ہی بات تھی۔ میں کسی طرح قبرستان وچوں نکل جانواں۔ میری جوتی میرے پاؤں سے نکل گئی تھی، پر جوتی کی ہوش کس کو تھی۔ ایک دم مجھ کو کسی شے سے ٹھیڈا (ٹھوکر) لگا۔ میں منہ بھار (منہ کے بل) گرا۔ اس وقت میں قبرستان کی حد وچوں نکل آیا تھا۔ بابے فیض کے گھر کے سامنے بھینسوں کی کھرلی پڑی تھی۔ میرا متھا کھرلی سے لگا۔ سخت چوٹ آئی۔ اکھیوں کے سامنے یک دم تارے سے ناچ گئے تھے۔ ایک سیکنڈ کے لیے تو مجھے کچھ پتا نہیں لگا کہ میرے نال کی ہویا ہے۔ بابے فیض کا ایک کارندہ اس وقت بھینساں کے پاس ہی سو رہیا تھا۔ وہ میری چیخ پکار سن کے جاگ پڑا مگر پر چھانوے (سائے) کو دیکھ کر وہ اتنا زیادہ ڈرا کہ میری مدد کرن کا خیال اس کے دماغ وچوں نکل گیا۔ وہ بس اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھیا، پر چھانواں بھی غائب

تھا۔ میرے متھے (پیشانی) وچوں خون کا فوارہ پھوٹ رہیا تھا۔ اس طرح لگدا تھا کہ کوئی میرے منہ پر گرم پانی ڈال رہیا ہے۔ میرے دماغ نے کام کیا۔ میں نے سوچا اگر میں یہیں بے ہوش کر گر پیا تو کوئی مجھ کو اٹھانے نہیں آئے گا۔ میں یہیں پر پڑا پڑا ٹھنڈ سے اکڑ جاؤں گا۔ میں نے ہمت کی اور گرتا پڑتا آپ کے دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ میرا اللہ ہی جاندا ہے کہ قبرستان سے آپ کے گھر تک میں کیسے پہنچا۔ ہر گھڑی مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی وہ منحوس پر چھانواں کسی گلی سے نکلے گا اور مجھ سے چمڑ جائے گا۔ بلکہ مجھ کو تو اب ایسے ہی لگدا ہے کہ وہ بدروح جیسی شے میرے آلے دوالے ہی موجود ہے......''

چاند اپنا بیان ختم کرتے کرتے ہانپ گیا تھا۔ سخت سردی میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کی چمک تھی۔

چاند کا بیان خاصا سنسنی خیز تھا لیکن میرے اور شوکت کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس بیان کو من وعن تسلیم کر لیں۔ اس بیان کے حوالے سے ہمارے ذہن میں کئی سوالات اٹھ رہے تھے، تاہم، ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ہم نے چاند سے یہ سوال کیے تو وہ جھنجلا جائے گا۔ اس کا یہ شک یقین میں بدل جائے گا کہ ہم اس کی باتوں کو قرار واقعی اہمیت نہیں دے رہے اور شاید اس کی دماغی حالت پر بھی شبہ کر رہے ہیں۔ چاند کے بیان کے حوالے سے جو بات فوری طور پر ذہن میں آئی تھی وہ یہ تھی کہ شدید خوف کے عالم میں چاند کو کچھ نظری دھوکے (بصری واہمے) ہوئے ہیں۔ اب وہم کتنے فی صد ہے اور حقیقت کتنے فی صد اس بارے میں کوئی فوری فیصلہ کرنا دشوار تھا۔

اس قسم کی باتیں چھپی کب رہتی ہیں۔ چاند نے جو کچھ بتایا تھا، وہ اگلے روز دوپہر تک پورے باغ پور میں مشہور ہو چکا تھا۔ لوگ چہ مگوئیاں کر رہے تھے، تبصرے ہو رہے تھے، چہروں پر خوف سجا ہوا تھا اور یہ خوف بہ تدریج گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دراصل جب اس قسم کی باتیں پھیلتی ہیں تو پھر ان میں اضافی نکتے اور مبالغے کے پہلو شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان باتوں کے اثرات میں بھی شدت آ جاتی ہے۔ یہاں باغ پور میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ افواہیں گردش کرنے لگی تھیں۔ چند ایک بے سر و پا باتیں خود میں نے بھی سنیں۔

جو کچھ ہو رہا تھا وہ بالکل قابلِ فہم تھا۔ حالات حقیقتاً خوف زدہ کر دینے والے تھے۔ پانچ چھ روز میں اوپر تلے تین پُر اسرار واقعات رونما ہو چکے تھے۔ ان واقعات میں دو افراد یعنی بشیرا اور صغراں جان سے ہاتھ دھو چکے تھے جب کہ ایک شخص (چاند) شدید زخمی ہوا تھا۔ چاند کے بیان نے اس سارے معاملے کو مزید الجھا دیا تھا، بلکہ کہنا یہ چاہیے، مزید پُر اسرار بنا دیا تھا۔ اس بیان کے ڈانڈے صاف طور پر پچھلے دو واقعات سے مل رہے تھے۔ چاند کا بیان مقتول بشیرے کی بیوی زبیدہ کے بیان سے بہت حد تک مطابقت رکھتا تھا۔ زبیدہ نے بشیرے کی موت سے چند گھنٹے قبل اپنے گھر کے صحن میں ایک پُر اسرار ہیولا دیکھا تھا۔ زبیدہ نے ہیولے کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے ہیولے کے چار ہاتھ بتائے تھے جبکہ ہیولے کا سر مٹکے کے برابر تھا۔ اس وقت زبیدہ کی باتوں پر بہت کم لوگوں نے یقین کیا تھا، لیکن پھر اوپر تلے دو پُر اسرار قتل ہو گئے تھے...... اور اب چاند جیسے ہوش مند بندے نے سرد رات کی تاریکی میں شدید زخمی ہونے کے بعد ایک ایسا بیان دیا تھا جو بہت حد تک زبیدہ کے بیان کی تائید کرتا تھا۔

تھانے میں حوالدار فدا حسین کی گفتگو میں اب خاص قسم کا اعتماد اور طمطراق آ گیا تھا۔ اس کے اس مؤقف کو زبردست تقویت ملی تھی کہ یہ سارا معاملہ روحانی ہے اور باغ پور میں ہونے والے دونوں خونی واقعات کے پیچھے آسیب وغیرہ کا چکر ہے۔ مجھ سے بھی حوالدار فدا حسین کی تھوڑی سی بات ہوئی۔ وہ میرا کندھا دبا کر سرگوشی میں بولا ''صاحب جی! مجھے پتا ہے کہ آپ دوسرے ذہن کے بندے ہیں لیکن آج نہیں تو کل آپ کو بھی یہ بات ماننا پڑے گی کہ یہاں باغ پور میں کچھ چل رہا ہے۔ کوئی ایسی شے یہاں موجود ہے جسے میں اور آپ نہیں دیکھ سکتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ کوئی ہوائی چیز؟'' میں نے کہا۔

''بالکل...... ایسا ہو سکتا ہے...... ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔'' اس نے بڑے یقین سے اپنا سر اوپر نیچے ہلایا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں نے گفتگو جاری رکھی تو مجھے حوالدار فدا سے ماضی کا کوئی بے ڈھنگا قصہ سننا پڑے گا۔ میں نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

حوالدار فدا اور کانسٹیبل عنایت کی باتوں سے پتا چلا کہ اس واقعے کی خبر باغ پور میں ہی نہیں اردگرد کے دیہات میں بھی پھیل چکی ہے۔ تقریباً نوے فی صد لوگوں کو یقین ہے کہ باغ پور میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور یہ کسی بندے بشر کا کام نہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آسیب کا چکر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ باغ پور میں کوئی خونی بلا آ گھسی ہے اور وہ گھات لگا کر لوگوں کو نقصان پہنچا رہی ہے۔

شوکت سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وہ صبح سویرے بس تھوڑی دیر کے لیے سویا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رت جگے کی سرخی تھی۔ میری کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ ہم تھانے کے صحن میں بیٹھے تھے۔ ایک دیوار پر تھوڑی سی دھوپ پڑ رہی تھی اور وہ غنیمت محسوس ہو رہی تھی۔

چاند نے بتایا تھا کہ جب وہ قبرستان کے اندر سے ڈر کر بھاگا تو فیض محمد کے مویشیوں کے پاس گرا۔ یہاں فیض محمد کے ایک کارندے نے بھی اس سائے کو دیکھا جو چاند کے پیچھے لپک رہا تھا۔ شوکت نے اس کارندے کو تھانے بلوایا تھا اور اب ہم اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد یہ شخص پہنچ گیا۔ وہ بہت اونچی ناک اور چھریرے جسم والا ایک عام سا دیہاتی تھا۔ عمر چوبیس پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کا نام طفیل تھا۔ اس کے ساتھ بابا فیض محمد بھی تھا۔ بابے فیض کے ہاتھ میں ایک پتیلی تھی اور ایک جوتا بھی تھا۔ یہ وہی پتیلی تھی جس میں چاند میٹھی دال لے کر ہماری طرف آ رہا تھا۔ جب وہ مویشیوں کے پاس پہنچ کر گرا اور چارے والی کھرلی سے ٹکرایا تو یہ پتیلی بھی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس کا جوتا قبرستان کے اندر سے گزرنے والے راستے سے ملا تھا۔

شوکت نے طفیل نامی شخص سے سوال جواب کیے۔ طفیل کی باتوں سے چاند کے بیان کی تصدیق ہوئی۔ طفیل نے بتایا کہ کل رات وہ مویشیوں کے پاس چھپر کے نیچے سو رہا تھا۔ غنودگی کی حالت میں اسے کسی کے بھاگنے اور شور مچانے کی آوازیں آئیں یہ چاند صاحب ہی تھے۔ وہ لکڑی کی کھرلی کے پاس اوندھے منہ گرے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور زور سے بولا ''کون ہے؟'' اس نے ایک سایہ دیکھا جو ڈیرے اور قبرستان کے درمیان جنتر کی جھاڑیوں میں کھڑا تھا۔ وہ کافی صحت مند لگتا تھا۔ بہ ظاہر سایہ کسی انسان کا تھا لیکن

اس کی گردن نظر نہیں آتی تھی۔ لگتا تھا کہ کندھوں کے اوپر ہی بہت بڑا سر رکھا ہوا ہے پھر وہ یک دم ٹھٹک کر جھاڑیوں کے پیچھے ہو گیا۔

میں نے طفیل نامی اس بندے سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کس کا سایہ تھا؟''

طفیل کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ وہ الجھن آمیز انداز میں بولا ''میں کچھ نہیں کہہ سکتا جناب...... وہ مجھ سے بیس تیس قدم دور کھڑا تھا۔ اندھیرا ابھی بہت تھا اور جھاڑیاں تھیں۔ مجھے بس اس کا پرچھاواں ہی نظر آ رہا تھا۔''

''چلو، تم یہ تو بتا سکتے ہو نا کہ وہ بندے کا پرچھاواں لگتا تھا یا جانور کا؟'' شوکت نے پوچھا۔

''ب...... بندے کا ہی لگتا تھا جی...... بندہ ہی اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہوتا ہے۔ مم...... میں نے آپ کو بتایا ہے نا، کہ میں کچھ بھی ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا......''

طفیل بری طرح گڑبڑایا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس پوچھ گچھ سے فٹافٹ اس کی جان چھوٹ جائے۔

ابھی شوکت ''طفیل اور بابے فیض محمد'' سے بات چیت کر ہی رہا تھا کہ ایک اے ایس آئی اندر آ گیا۔ یہ شوکت کے تھانے کا نہیں تھا۔ پتہ چلا کہ یہ سرگودھا سے آیا ہے اور اس کی حیثیت ایس پی قربان چٹھا صاحب کے خصوصی نمائندے کی ہے۔ یہ اے ایس آئی قربان چٹھا صاحب کا قریبی عزیز بھی تھا۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن شوکت اسے گڈو کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ وہ گڈو کے ساتھ بڑی بے تکلفی اور حلیمی سے بول رہا تھا۔

اے ایس آئی گڈو کی زبانی پتا چلا کہ باغ پور میں پیش آنے والے تازہ ترین واقعے کی خبر ایس پی صاحب تک بھی پہنچ چکی ہے اور وہ اس حوالے سے پریشان ہیں۔ ان دنوں مواصلات کا نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ خاص طور سے دور دراز کے تھانوں سے اعلیٰ افسران کا رابطہ بڑی مشکل سے ہو پاتا تھا۔ خط ارسال کیے جاتے تھے یا پھر گھڑسوار کارندوں کو زبانی پیغامات دے کر بھیجا جاتا تھا۔ گڈو بھی اس طرح لمبا سفر کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ ایس پی چٹھا صاحب نے گڈو کے ذریعے شوکت سے اب تک کی تحریری رپورٹ

مانگی تھی۔ گڈو سے زبانی بات چیت کے بعد شوکت تحریری رپورٹ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ایک رپورٹ پہلے بھی روانہ کر چکا تھا جس میں بشیرے اور صغراں کی اموات کا ذکر تھا اور دونوں کیسوں پر ہونے والی تفتیش کا مختصراً احوال بھی تھا۔ اپنی نئی رپورٹ میں شوکت نے ایس پی صاحب کو بتایا ''بدلی ہوئی صورت حال میں پچھلی تفتیش کافی حد تک بیکار محسوس ہو رہی ہے۔ ہم نے اب تک اس مفروضے پر کام کیا ہے کہ صلو اور زبیدہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو حاصل کرنے کے لیے اپنے اپنے راستے کی رکاوٹیں ہٹائی ہیں۔ شروع میں اس بات کے اندر کافی وزن محسوس ہوتا تھا لیکن اب تک کی تفتیش سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض ایک اتفاق تھا۔ جو معلومات اب تک حاصل ہوئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ صلو اور زبیدہ میں تعلقات تو بے شک موجود تھے لیکن اب ان میں وہ پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔ کم از کم اتنی شدت نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے کو پانے کے لیے دو انسانی جانوں سے کھیل جاتے۔ اسے ہم ایک اتفاق کہہ سکتے ہیں کہ بشیرا اور صغراں دو تین روز کے وقفے سے ناگہانی موت کا شکار ہوئے۔ ہماری اس سوچ کو کل رات والے واقعے سے مزید تقویت مل رہی ہے۔ قبرستان کے قریب زخمی ہونے کے بعد چاند نوازش نے جو بیان دیا ہے وہ بڑی حد تک بشیر کی بیوہ زبیدہ کے بیان سے ملتا ہے۔ اس مفصل بیان کی کاربن کاپی میں آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ چاند نے حملہ آور کا جو نقشہ اور حلیہ بیان کیا ہے اس سے یہ شبہ مضبوط ہوتا ہے کہ یہ تینوں واقعات ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔ میں آپ سے رابطہ قائم رکھوں گا۔ جونہی ادھر سے فرصت ملی میں خود حاضر ہو کر تفصیل بیان کروں گا۔''

یہ تحریر لکھ کر شوکت نے گڈو صاحب کے حوالے کر دی اور ساتھ میں زبانی بھی سمجھا دیا کہ موجودہ صورتِ حال کیا ہے۔

جس وقت شوکت اور گڈو مصروفِ گفتگو تھے میں نے گاؤں کے دائرے (بیٹھک) کا رخ کیا۔ دیہات کے دائرے میرے لیے ہمیشہ سے پسندیدہ جگہ رہے ہیں۔ ان جگہوں پر عجیب سی رومانیت پائی جاتی ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے یہاں جمع ہوتے ہیں اور دنیا جہاں کی باتیں کرتے ہیں۔ اکثر اوقات نوجوان بھی آ جاتے ہیں اور اپنی علیحدہ

ٹولی بنا لیتے ہیں۔ لڑکے بالے کونے کھدروں میں دبک کر بڑوں کی باتیں سنتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں۔ کہانیاں سنائی جاتی ہیں، لطیفوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ہنسی مذاق کیا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ آگ سینکی جاتی ہے، گنے چوسے جاتے ہیں، بھنے ہوئے چنے چبائے جاتے ہیں۔ ان چوپالوں میں کبھی کبھی ہنسی مذاق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ تلخی کی نوبت آ جاتی ہے۔ ایسے میں بڑے بوڑھے معاملہ رفع دفع کراتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں لڑنے بھڑنے والے پھر سے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگا رہے ہوتے ہیں۔ دائرہ ایک طرح سے پورے گاؤں کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ گاؤں کے شب و روز کی ہر جھلک یہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

میں دائرے میں پہنچا تو سہ پہر ہو رہی تھی لیکن سورج کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور سردیوں کی کمزور، لاچاری دھوپ بھی غائب ہو چکی تھی۔ راستے میں گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے مجھے عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی تھی۔ ہر جاندار اور بے جان شے جیسے خوف کے کہرے میں جا دبکی تھی۔ مجھے کہیں کوئی بچہ کھیلتا نظر نہیں ایا۔ اکثر گھروں کے دروازے بند تھے۔ ابھی شام دور تھی لیکن لگتا تھا کہ گلی کوچوں میں ویرانی پر پھیلانے لگی ہے۔

دائرے کی دھواں دھواں فضا میں لوگ موجود تھے، بلکہ کافی لوگ موجود تھے۔ حسبِ توقع بحث کا موضوع وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ گاؤں کے چند پڑھے لکھے لوگ جن میں ماسٹر ریاض اور کمپاؤنڈر رحمت وغیرہ بھی شامل تھے اس معاملے کو اپنے انداز سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی جرائم پیشہ شخص ہے جس نے لوگوں کو ڈرانے کے لیے بہروپ بھر رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے چہرے پر کچھ چڑھا رکھا ہو یا اس قسم کا کوئی اور حربہ اختیار کر رکھا ہو۔ کچھ یہ کہہ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے، یہ کوئی عجیب الخلقت جنگلی جانور ہو۔ کسی نے اب تک اسے روشنی میں نہیں دیکھا۔ سایہ دیکھ کر یہ کہنا کہ وہ کوئی ''بندہ'' ہے، ٹھیک نہیں ہے۔

ماسٹر نور دین نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات اتنی بے وزن نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو یاد ہی ہوگا، پچھلے سے پچھلے برس ''ججے پور'' گاؤں میں کیا ہوا تھا۔''

''کیا ہوا تھا؟'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا۔

''ہاں مجھے یاد آ گیا ہے۔'' ماسٹر نوردین کے بجائے ڈاکیے عبدالرحمان نے کہا۔

''جے پور میں خونی جانور کے چرچے ہوئے تھے۔ کئی لوگوں نے کہا تھا کہ گاؤں میں کوئی خونی بلا گھس گئی ہے جو راہ گیروں کو زخمی کر رہی ہے۔''

بہت سے لوگوں کو وہ بات یاد آ گئی اور وہ اپنے سر اثبات میں ہلانے لگے۔

کمپاؤنڈر رحمت نے کہا۔ ''وہ خبر تو اخبار میں بھی چھپ گئی تھی۔ اللہ بخشے باؤ اعجاز شہر سے اخبار لے کر آ رہا تھا...... لیکن بعد میں نتیجہ کیا نکلا۔''

''کیا نکلا؟'' میں نے پوچھا۔

کمپاؤنڈر رحمت نے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں جی...... کوئی بلا شلا نہیں تھی...... وہ ''سیہ'' کی نسل کا کوئی جانور تھا جو دریائی علاقے میں کبھی کبھار دیکھنے میں آتا ہے۔''

دائرے کی دھواں دھواں فضا میں تازہ ترین حالات پر گفتگو جاری رہی۔ عام طور پر عورتیں گاؤں کے دائرے میں موجود نہیں ہوتیں لیکن یہ غیر معمولی حالات تھے۔ دو چار عورتیں بھی کونے کھدروں میں کھڑی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ باغ پور کا ان پڑھ طبقہ خاص طور سے عورتیں نہایت خوف زدہ ہیں۔ اکثر خواتین بے حد یقین سے ہوائی چیزوں اور ان کی کارستانیوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ موجودہ واقعات کے حوالے سے ان کا تجزیہ تھا کہ گاؤں کے قبرستان میں کوئی ہوائی چیز موجود ہے۔ وہ تاریکی میں نکلتی ہے اور لوگوں کو ہلاک کرتی ہے۔

میرے لیے یہ سب بہت سنسنی خیز تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ لاہور...... لاہور کی روشنیاں...... وہاں کی جدید زندگی دور بہت دور رہ گئی ہے۔ میں ایک پُراسرار ماحول میں آ گیا ہوں۔ جہاں انہونیاں ہو رہی ہیں اور لوگ انہونے انداز میں سوچ رہے ہیں۔ اس دوران میں حوالدار فدا حسین بھی دائرے میں پہنچ گیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا۔ وہ باغ پور ہی کا رہنے والا تھا۔ مقامی لوگوں کے ساتھ وہ گھل مل کر باتیں کرتا تھا۔ مجھے اب تک کے میل جول سے بڑی اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ فدا حسین زبردست توہم پرست واقع ہوا ہے۔ وہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک پر بہت یقین رکھتا تھا۔ درحقیقت وہ دیہاتی

پولیس کے اس طبقے سے تھا جو ملزموں کی تلاش کے لیے لوٹا گھماتے تھے اور طوطوں سے فالیں نکلواتے تھے۔ فدا حسین نے ''دائرے'' کے معزز ترین فرد بابے صادق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''چاچا...... ! آپ مانیں یا نہ مانیں پر میرا دل کہتا ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ''سچے سائیں'' کی وزہ (وجہ) سے ہو رہا ہے۔ یہ دراصل ہماری غلطیوں کی سجا (سزا) ہمیں مل رہی ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' بابے صادق نے وضاحت طلب کی۔

''میرے کھیال میں ان ساری باتوں کی آپ کو بھی کھبر ہے۔ سچے سائیں کی طرف ہمارا دھیان کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا پچھلے عرس پر کیا ہوا تھا۔ مشکل سے تین سو بندہ اکٹھا ہوا ہوگا وہاں لنگر بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔''

کمپاؤنڈر رحمت نے کہا۔ ''یار فدا...... ! تمہیں پتا ہی ہے اس دن تیز بارش تھی اور......''

''بارش کی وزہ سے کوئی اور کام تو نہیں رکا۔'' فدا حسین نے تیزی سے بات کاٹ کر کہا۔ ''رمجان تیلی کی بیٹی کی شادی بھی تو اسی دن ہوئی تھی اور چوہدری جی کے بھتیجے کے ختنے بھی ہوئے تھے۔ ہوئے تھے کہ نہیں؟''

''شادی کی تو مجبوری تھی۔ منڈے والوں کو تاریخ دی ہوئی تھی......'' ماسٹر نوردین نے وضاحت کی۔

''ماسٹر، میں تم سے بات نہیں کر رہا۔ تم تو ویسے ہی اللہ والوں کے منکر ہو۔''

ایک طویل بحث شروع ہو گئی۔ حقے زیادہ تیزی سے گڑگڑائے جانے لگے۔ آوازیں کبھی تیز ہو جاتیں، کبھی مدھم پڑ جاتیں۔ ہاتھوں کے اشارے بھی اسی طرح کبھی درشت ہو جاتے کبھی نرم پڑ جاتے۔ میں نے قریب بیٹھے ڈاکیے عبدالرحمن سے پوچھا۔ ''یہ سچے سائیں کا کیا معاملہ ہے؟''

''کچھ بھی نہیں جی......'' وہ سرگوشی میں بولا۔ ''حوالدار پیری فقیری پر بڑا یقین رکھتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں ایسے لوگ ہر معاملے کو دوسرا رنگ دے دیتے ہیں۔ سچے سائیں کا مزار یہاں سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ کافی اونچا ٹیلا ہے جس پر مزار بنا ہوا

ہے۔راستہ بھی بڑا دشوار گزار ہے۔آخری دو ڈھائی میل کا راستہ تو بہت ہی مشکل ہے۔یہ وجہ ہے کہ کم لوگ وہاں حاضری دینے جاتے ہیں۔زیادہ تر لوگ اب ردھو والی کی طرف شمسی درگاہ پر چلے جاتے ہیں۔باغ پور میں جو لوگ سچے سائیں کے پکے مرید ہیں، ان کا خیال ہے کہ مزار پر کم حاضری کی وجہ سے سائیں جی ناراض ہو گئے ہیں۔پچھلے کچھ دنوں سے باغ پور میں جو حادثات ہو رہے ہیں۔ان کی وجہ سائیں جی کی ناراضی ہی ہے۔''

حوالدار فدا حسین اور ماسٹر نور دین کی بحث نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔اس دوران میں جواں سال افراد کی ایک ٹولی ماسٹر نور دین کے حق میں بولنے لگی اور حوالدار فدا حسین کا پلہ ہلکا ہو گیا۔جواں سال ٹولی کی رائے بھی یہ تھی کہ جو خون خرابا ہوا ہے، اسے کسی جن بھوت کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔یہ کسی جرائم پیشہ بندے کا کام ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ کوئی جانور ہو۔کوئی پالتو بن مانس یا پھر کسی مداری کا فرار ہو جانے والا ریچھ یا اس قسم کی کوئی اور شے۔اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق لوگ مختلف خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

جس گروہ کا خیال تھا کہ یہ کوئی جانور یا عجیب الخلقت جانور ہو گا انہوں نے فیصلہ کیا کہ قبرستان اور نواحی کھیتوں کے گرد گھیرا ڈال کر ہانکا کیا جائے یعنی خوب ڈھول کنستر بجائے جائیں اور اس امکانی جانور کو ہانک کر اس کی پناہ گاہ سے باہر لایا جائے۔گاؤں کے جوان اور لڑکے بالے اس تجویز کے زبردست حامی بن گئے اور اپنے جوش و خروش کا اظہار کرنے لگے۔حوالدار فدا حسین اور اس کے ہمنوا برے برے منہ بنا رہے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس ''روحانی مسئلے'' کا روحانی حل ہونا چاہیے اور خوامخواہ کا شور شرابہ حالات کو مزید خراب کر سکتا ہے۔

سورج ڈوبنے سے پہلے ہی باغ پور کا یہ حال ہو گیا کہ تمام گلیاں اور راستے سنسان نظر آنے لگے۔میں اس وقت تھانے میں شوکت کے پاس موجود تھا۔شوکت نے روٹین کی پوچھ گچھ کے لیے متوفی بشیرے کی بیوہ زبیدہ کو بلایا ہوا تھا اور اس سے باتیں کر رہا تھا۔زبیدہ کا سسر بھی اس کے ساتھ تھا۔اس دوران میں گاؤں کے چند سرکردہ افراد تھانے آئے۔انہوں نے شوکت سے کہا کہ انہوں نے اپنے طور پر گاؤں میں ٹھیکری پہرے کا انتظام کر لیا ہے۔نو جوانوں کی تین ٹولیاں بنائی گئی ہیں، جو رات بھر گاؤں میں گشت کرتی

رہیں گی۔ہر ٹولی کے پاس کم از کم ایک بندوق یا پستول ہو گا۔ماسٹر نور دین نے شوکت سے درخواست کی کہ پولیس کے دو بندے بھی ہر ٹولی کے ساتھ موجود رہیں تو بہت اچھا ہو گا۔

شوکت کے پاس کافی عملہ موجود تھا۔اس نے ایک اے ایس آئی اور چار کانسٹیبل گاؤں والوں کے ساتھ روانہ کر دیئے۔

ماسٹر نور دین نے یہ بھی بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے قبرستان اور آس پاس کے کھیتوں میں ہانکا بھی کیا گیا ہے مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔

گاؤں والے واپس چلے گئے۔ایک سنتری نے انگیٹھی دہکا کر کمرے میں رکھ دی۔سر شام ہی سخت ٹھنڈ ہو گئی تھی۔روزانہ کی طرح ایک طویل کالی شب سر پر تھی اور اس شب میں ایک بھیانک اندیشہ سانپ کی طرح سرسرا رہا تھا۔اب ہم کمرے میں اکیلے تھے۔ہم نے منطقی انداز میں اب تک کے واقعات کا تجزیہ شروع کر دیا۔جیسا کہ میں نے بتایا ہے، شوکت ایک پڑھا لکھا تھانے دار تھا۔دیہاتی ماحول میں رہنے کے باوجود نمک کی کان میں نمک نہیں ہوا تھا۔وہ اپنی تفتیش کو عقل کے پیمانے اور ٹھوس شہادتوں کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتا تھا۔ہوائی چیزوں اور ان کی پُراسرار کارستانیوں پر یقین کرنا، میری طرح اس کے بس میں بھی نہیں تھا۔ہم دونوں ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے اور ہمارے تجزیے کا رنگ ڈھنگ بھی ایک ہی تھا۔

شوکت لالٹین کی لو اونچی کرتے ہوئے بولا۔''ہاں یار اسلم! کچھ روشنی ڈالو ان حالات پر اپنے انداز میں......''

''اپنے انداز سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''بھئی۔وہی صحافیانہ اسٹائل...... جس میں چونکہ، چنانچہ، گویا، دریں اثنا، بعد ازاں، جیسے الفاظ کا وافر استعمال ہوتا ہے۔''

''ایک تو تم نے میری چھٹیاں برباد کر دیں۔اوپر سے مذاق کا نشانہ بنا رہے ہو۔میرا خیال ہے کہ اس گورکھ دھندے سے نکل کر لاہور سدھار لوں تو بہتر ہے۔''

''اپنے جگری یار کو اس انوکھی مصیبت میں چھوڑ کر جاؤ گے تو حیا نہیں آئے گی؟''

"سچ کہتے ہیں، پولیس والوں کی دوستی اچھی نہ دشمنی۔"

"اچھا چھوڑو ان گھسے پٹے محاوروں کو۔ ذرا اپنے روشن روشن تبصرے سے میری کھوپڑی روشن کردو۔"

کچھ دیر تک ہمارے درمیان نوک جھوک ہوئی پھر میں نے نیا سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دیکھا دیکھی ہراس کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ سب سے بڑا اور سب سے خطرناک آسیب تو "خوف کا جذبہ" ہوتا ہے جو انسانی ذہن کو اس طرح جکڑتا ہے کہ ہر طرف آسیب ہی آسیب نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر ہم شروع سے ان واقعات پر غور کریں تو واقعات کی کڑیوں کو یوں ملایا جا سکتا ہے۔ ایک اکیلی عورت یعنی زبیدہ کو اپنے گھر کے صحن میں کوئی عجیب شے کھڑی نظر آئی۔ کوئی ہیولا تھا...... کوئی سایہ تھا یا کچھ اور...... بہرحال زبیدہ کے ڈرے ہوئے ذہن نے اس شے کو ایک بلا کی شکل دے دی یا پھر ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت رہی ہو۔ بہرحال، زبیدہ کے سنسنی خیز بیان کے چند ہی گھنٹے بعد اس کا شوہر بشیرا قتل ہو گیا۔ اس قتل کا تذکرہ قرب و جوار میں پھیل گیا۔ خوف کی فضا پیدا ہوئی اور لوگوں کے ذہنوں میں ایک طرح کا ڈر جڑ پکڑ گیا۔ ناخوشگوار اتفاق یہ ہوا کہ اس کے بعد دوسری واردات ہوئی۔ صغراں کی لاش گنے کے کھیت میں پائی گئی۔ مجرم کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ لوگوں کے ذہنوں میں جما ہوا ڈر کچھ اور بھی شدید ہو گیا۔ تمہارا دوست چاند بھی انہی لوگوں میں شامل تھا اور اسی ماحول کا حصہ تھا...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اپنی بات جاری رکھو۔" وہ انگیٹھی کے دونوں جانب پاؤں پھیلاتے ہوئے بولا۔

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا۔ "چاند کے ذہن میں بھی وہی خوف موجود تھا جس نے دوسرے لوگوں کو گھیر رکھا تھا۔ کل جب چاند تاریک سرد رات میں قبرستان کے پاس سے گزرا تو لاشعوری طور پر وہ خوف زدہ تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی ممکن ہے کہ کہیں کوئی آہٹ ہوئی ہو یا درخت کا سایہ جھوما ہو یا پھر کسی قبر کی چادر وغیرہ اڑ کر چاند کی طرف آئی ہو۔ بہرحال اس قسم کا کوئی بھی واقعہ ہو سکتا ہے۔ پہلے سے ڈرا ہوا چاند کچھ اور ڈر گیا اور

دوڑ پڑا۔ اس کا جسم تنومند ہے۔ ایسا شخص تاریکی میں اور خوف کے عالم میں زیادہ دور تک نہیں دوڑ سکتا۔ قبرستان سے نکلتے نکلتے اسے ٹھوکر لگی اور وہ فیض کے مویشیوں کے پاس اوندھے منہ گر گیا۔"

میں نے ایک لمحہ توقف کیا اور شوکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی پُراسرار سایہ واقعی چاند کا پیچھا کر رہا تھا اور وہ اسے نقصان بھی پہنچانا چاہتا تھا تو پھر چاند کو زمین بوس چھوڑ کر واپس کیوں چلا گیا۔ اس نے چاند پر حملہ کیوں نہیں کیا؟"

"اس کی وجہ طفیل احمد رہا ہوگا۔ وہ چاند کا شور سن کر جاگ گیا تھا۔ حملہ آور نے جب ایک کے بجائے دو بندے دیکھے تو واپس چلا گیا۔"

"تم نے چاند کے بیان پر زیادہ غور نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "چاند کا کہنا ہے کہ طفیل جاگنے کے بعد فوراً ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

"لیکن طفیل نے تو کہا ہے کہ اس نے چاند کو گرتے دیکھا تھا اور پھر اس کے پیچھے ہیولے کو بھی دیکھا تھا۔ بعد میں اس نے ہیولے کو للکارنے کی کوشش بھی کی تھی۔"

"طفیل اور چاند کے بیان میں تضاد ہے محترم انسپکٹر صاحب، میرا خیال ہے کہ تم طفیل کو تھوڑا سا مزید کریدو۔"

تقریباً آدھ گھنٹے بعد طفیل نامی وہ کارندہ پھر شوکت کے سامنے تھا۔ اس مرتبہ شوکت نے اس کے ساتھ ذرا سختی سے بات کی۔ وہ کڑک کر بولا۔ "دیکھ طفیلے! میرے ساتھ اونگی بونگی نہیں مارنی جو کچھ بھی تم نے دیکھا یا سنا ہے، مجھے صاف صاف بتاؤ۔ ایک لفظ کی کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے۔ سنا ہے؟ ایک لفظ کی کمی بیشی بھی نہیں!"

طفیل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "مائی باپ! میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا مم...... میرا کوئی فائدہ نہیں جی اس میں۔"

"چاند کا کہنا ہے کہ تم چارپائی سے اٹھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ جب کہ تم کہتے ہو، تم وہیں رکے رہے۔ تم نے چاند کے پیچھے آنے والے کو دیکھا...... اور اسے للکارا بھی۔"

کچھ دیر تک طفیل نے اپنے پہلے بیان کا دفاع کرنے کی کوشش کی لیکن شوکت بڑی سخت زبان بول رہا تھا۔ جلد ہی طفیل نے ہار مان لی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی مان لیا کہ اس نے غلط بیان کی ہے۔ اس نے چاند صاحب کے پیچھے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ بولا۔

''میں جب جاگا تو چاند صاحب بھاگے ہوئے میری طرف آ رہے تھے۔ ان کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں پھر وہ بیلوں کی کھرلی کے پاس آ کر گر گئے۔ مجھے ان کے پیچھے کوئی شے نظر نہیں آئی۔ بس میں نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ ڈر کر بھاگے ہیں تو ان کے پیچھے کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔''

شوکت نے طفیلے سے کچھ مزید سوال جواب کیے اس کے بعد اسے واپس بھیج دیا۔

اس کے جانے کے بعد ہم دیر تک تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ طفیل کے نئے بیان سے ان خیالات کی تائید ہوتی تھی جو ابھی تھوڑے دیر پہلے میں نے شوکت کے سامنے بیان کیے تھے۔ بعض اوقات بے جا خوف انسانی ذہن کو اس طرح جکڑتا ہے کہ وہ بے وجود چیزوں کو دیکھنے اور سننے لگتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کل رات چاند کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ واہمے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ قبرستان سے گزرتے وقت اس کے ڈرے ہوئے ذہن نے تاریکی کے پردے پر کچھ اشکال بنائی ہوں اور اسے سرپٹ بھاگنے پر مجبور کر دیا ہو۔

☆=====☆=====☆

یہ اگلی شام کا واقعہ ہے۔ شوکت نے مجھے بتایا کہ چوہدری ارباب نے ہم دونوں کی دعوت کر رکھی ہے۔ شوکت نے بتایا کہ کام سے فارغ ہو کر آٹھ بجے کے قریب چوہدری کی حویلی میں جائیں گے۔

''یار! میرا جانا کیا ضروری ہے؟'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''اوئے کھوتے! چوہدری تیری شان ہی تو بڑھانا چاہ رہا ہے۔ اسے پتا ہے کہ تُو میرا لنگوٹیا یار ہے۔''

''میں جانتا ہوں شوکے، یہ چوہدری اور زمیندار لوگ کسی کی عزت افزائی نہیں کرتے۔ یہ بس اپنے نمبر بناتے ہیں اور اپنے رستے سیدھے کرتے ہیں۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ چوہدری بہت گہرا بندہ ہے۔ یہ عام چوہدریوں کی طرح گرجتا برستا نہیں ہے اور جو لوگ گرجتے برستے نہیں وہ خاموشی سے برس بھی جاتے ہیں۔ میں نے.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''یار! تم جانتے ہو کہ مجھے ادھوری بات سے چڑ ہے!'' میں نے کہا۔

''اور تم بھی جانتے ہو کہ میں نے تم سے کبھی ادھوری بات نہیں کی۔''

''تو پھر اب کیوں کر رہے ہو؟''

''کوئی خاص بات نہیں تھی یار......''

''چلو جو ''عام'' ہے وہی بتا دو۔''

شوکت نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''کیوں نہیں۔ بس کل مجھے ایک ہلکا سا شک ہوا تھا۔ چاند کے زخمی ہونے کے بعد میں چوہدری کی حویلی میں گاڑی لینے کے لیے گیا تھا۔ میری دستک پر چوہدری کے ایک کارندے نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا اور سلام

کیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ عالمگیر کو بلائے۔ کارندہ عالمگیر (یعنی چوہدری کے بیٹے) کو بلانے چلا گیا۔ میں ڈیوڑھی میں ہی کھڑا رہا۔ اس وقت تیز ہوا چل رہی تھی۔ مجھے حویلی کے اندر سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی عورت کسی بند کمرے کے اندر چیخ رہی ہے۔ اس وقت چاند کی پریشانی تھی اور بہت جلدی بھی تھی۔ میں ان آوازوں پر زیادہ غور نہیں کر سکا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی عورت کے بجائے بچے کی آواز ہو۔ میں اس بارے میں عالمگیر سے پوچھنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن پھر جلدی میں یہ بات بھی ذہن سے نکل گئی۔ آج صبح جب عالمگیر کو دیکھا تو پھر سے یہ واقعہ ذہن میں آ گیا۔

ہماری باتوں کے دوران میں ہی گاڑی کے انجن کا شور سنائی دیا۔ اس گاؤں میں دو ہی گاڑیاں تھیں۔ ایک شوکت والی کھٹارا جیپ...... دوسری چوہدری کے انگریز مہمانوں کی سرخ کار۔ جیپ تو سامنے تھانے کے صحن میں کھڑی تھی۔ یہ انگریزوں کی شیورلیٹ کار ہی ہو سکتی تھی۔ وہ دھول اڑاتی ہوئی تھانے کے عین سامنے سے گزری اور حویلی کی طرف چلی گئی۔ مجھے خوب رو سلویا یاد آ گئی اور اس کے ساتھ ہی کونج کے شکار کا وہ واقعہ بھی یاد آ گیا جو دو دن پہلے صبح سویرے پیش آیا تھا۔

میں اور شوکت کچھ دیر تک چوہدریوں اور ان کے مہمانوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میں سرقہ بالجبر کا ایک کیس تھانے میں آ گیا اور شوکت اپنے سائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شام ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم چوہدری ارباب کی حویلی میں پہنچے۔ یہ نیم پختہ حویلی اپنی اونچی دیواروں، برجیوں اور رنگ دار شیشوں کے ساتھ گاؤں میں سب سے نمایاں نظر آتی تھی۔ پورے گاؤں کی طرح حویلی کے اردگرد بھی ایک پُراندیش خاموشی طاری تھی۔ حویلی کے پھاٹک پر دو مسلح افراد پہرے داری کر رہے تھے۔ حویلی کے اندر داخل ہوئے تو رونق نظر آئی۔ حویلی کی اندرونی آرائش اور سجاوٹ باہر سے بڑھ کر تھی۔ چوہدری کے بیٹے عالمگیر نے تپاک سے استقبال کیا اور اندر وسیع و عریض بیٹھک میں لے آیا۔ یہاں وہ تینوں انگریز موجود تھے جن سے دو دن پہلے کھیتوں میں ملاقات ہوئی تھی۔ ماہ جبیں سلویا بھی موجود تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ مجھے اس کی

نیلگوں آنکھوں میں شناسائی کی چمک نظر آئی۔ چوہدری ارباب کے علاوہ ایک مقامی شکاری بھی بیٹھک میں موجود تھا۔ اس کا نام بعد میں رازی جان معلوم ہوا۔ وہ پختہ رنگ اور درمیانی عمر کا شخص تھا۔ چوہدری ارباب حسبِ معمول سفید براق دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ سر پر اونچے شملے والی پگڑی تھی۔ چوہدری کے سرخ و سپید چہرے پر تمازت محسوس ہو رہی تھی۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ شراب کی تمازت ہے۔ الکحل کی بو چاروں طرف محسوس ہو رہی تھی۔ ایک گوشے میں تپائی پر مینا و ساغر دکھائی دے رہے تھے۔ دراصل یہاں شراب و کباب اور رقص و سرور کی بے تکلف محفل جمی ہوئی تھی۔

سب نے ہمیں خوش دلی سے ویلکم کہا۔ انگریز صاحبان سے میرا تعارف ہو چکا تھا۔ عالمگیر نے بے تکلفی سے جانی واکر کی بوتل میری طرف بڑھائی اور پینے کی دعوت دی۔ میں نے شائستگی سے انکار کر دیا۔ سلویا اٹھلا کر بولی۔

”چلیں، اس فنکشن میں کوئی تو امارا ساتھی بنا۔“

اس کے کہنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ شراب خانہ خراب سے شوق نہیں فرماتی۔

چوہدری ارباب نے شوکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں آپ کا ایک ساتھی اور بھی ہے۔“

”یہ تو اور بھی خوشی کا بات ہے۔“ سلویا نے اپنا سر اوپر نیچے ہلایا۔

ہم ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگے لیکن گفتگو کا رخ بہت جلد باغ پور کے تشویش ناک حالات کی طرف مڑ گیا۔ چاند کے زخمی ہونے کا ذکر بھی ہوا اور اس خوف و ہراس پر بھی بات ہوئی جو عام لوگوں میں پھیل رہا تھا۔

میں اس سارے معاملے کے حوالے سے چوہدری کے انگریز مہمانوں کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ یہ لوگ معاملات کو بڑی باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی بڑے پتے کی بات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، انگریزوں میں جیکب اور ہارڈی دونوں بھائی تھے۔ ان میں سے جیکب بڑا تھا۔ اس کی صحت اچھی تھی ورنہ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس سال سے اوپر ہی تھی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے سے امارت اور آسودگی جھلکتی تھی۔ اس

کی گھنی بھنویں اور نہایت سنجیدہ چہرہ اس کے تجربے اور اس کی قوتِ برداشت کو ظاہر کر
تھا۔ دو روز پہلے کنویں پر ہونے والی گفتگو کے دوران میں مجھے پتا چلا تھا کہ جیکب لندن
کسی کمپنی میں حصے دار ہے اور اس کمپنی کا تعلق لوگوں کو تفریح وغیرہ فراہم کرنے سے ہے
آج اس بارے میں کچھ مزید تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ وہ اس کمپنی میں ایک چوتھائی
شیئر ہولڈر تھا۔ جیکب کا چھوٹا بھائی ہارڈی اس کے معاون کے طور پر کام کرتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں جیکب سے بات کرتا، وہ پائپ کا کش لیتے ہوئے خود ہی بول
اٹھا۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ''یہاں عجیب واقعات ہوئے ہیں۔ لوگ ڈرے ہوئے
ہیں۔ سچی بات ہے کہ میں نے آج تک ایسی سراسیمگی کی حالت نہیں دیکھی، لوگ ایسی
باتیں کر رہے ہیں جن پر یقین کرنا مشکل ہے مگر وہ اتنے اعتماد سے بولتے ہیں کہ رونگٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چشم دید گواہوں نے حملہ آور کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ نا قابل یقین
ہے لیکن ان کا اصرار ہے کہ وہ وہی بیان کر رہے ہیں جو انہوں نے دیکھا ہے۔''

سلویا اپنے خوبصورت دانتوں کی نمائش کر کے بولی۔ ''چوہدری صاحب...... ہام کا
خیال ہے کہ آپ کو زیادہ دیر ہمارا مہمان داری نائیں کرنا پڑیں گے۔''

چوہدری کی سمجھ میں شاید یہ بات نہیں آئی لیکن میں اور شوکت مسکرا دیے۔ سلویا کا
مطلب تھا کہ موجودہ حالات سے وہ چاروں بھی خوف زدہ ہیں اور باغ پور سے واپس جانا
چاہتے ہیں۔

میں نے جیکب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر جیکب! آپ نے موجودہ
حالات کے حوالے سے کیا نتیجہ نکالا ہے......''

ابھی میرا سوال مکمل نہیں ہوا تھا کہ جیکب بول اٹھا۔ ''ایڈیٹر صاحب! اس قسم کے
واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے ایک ہی طرح کی وارداتیں ہوتی
ہیں اور لوگ جان سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ چند ماہ پہلے ایسٹ لندن میں بھی اس طرح ایک
سیریل کلنگ ہوئی تھی اور قاتل گرفتار نہیں ہو سکا تھا۔ اس واقعے نے بھی کافی سراسیمگی
پھیلائی تھی۔''

اس نے پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے تمباکو کی تھیلی نکالی اور بات جاری رکھتے

ہوئے شستہ انگریزی میں بولا۔ ''میں ذاتی طور پر حقیقت پسند شخص ہوں لیکن کوئی بھی اس
طرح کے معاملے میں حتمی رائے نہیں دے سکتا۔ جادو اور ہپناٹزم وغیرہ ایسی چیزیں ہیں
جن کا اعتراف اب سائنس بھی کرنے لگی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ایسا ہے جو آپ
اور ہم جیسے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ مغرب میں بھی آسیب، ارواح اور جادو وغیرہ
کے بارے میں سنجیدہ قسم کی بحثیں ہوتی ہیں۔ بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے۔''

''آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ باغ پور میں پیش آنے والے واقعات کا کوئی غیر مرئی
پہلو ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سوری جناب!'' جیکب نے نفی سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں کے حالات
کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں اور ایسی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہوں کہ کوئی واضح رائے
قائم کر سکوں۔ بہرحال یہ سارا معاملہ دلچسپ اور توجہ طلب ہے۔''

سلویا بولی۔ ''ہام کو تو لگ رہا ہے ایڈیٹر صاحب! کہ ہام پاکستان کے بجائے کہیں
افریقا میں ہے۔ وہاں میجک اور گھوسٹ وغیرہ کا بہت چرچا رہتا ہے۔ لاسٹ ایئر میں
تنزانیہ میں تھی۔ اسمتھ بھی میرے ساتھ تھا۔ ہام نے وہاں بلیک میجک کا بہت سا کرشمہ
دیکھا۔''

گفتگو کے دوران میں اچانک میری نظر بیٹھک کے ادھ کھلے دروازے سے گزر کر
ایک چہرے پر پڑی۔ یہ بابے صادق کا چہرہ تھا۔ باغ پور کا وہی سرخ و سپید اور ہر دل عزیز
بوڑھا جس کی ٹانگوں میں جوانوں جیسی طاقت تھی اور جس نے بے خبری میں سلویا کو کھیت
میں گرا کر خوب رگڑے دیے تھے۔

جونہی میری نظر پڑی بابا صادق فوراً دروازے سے ہٹ گیا۔ اب وہاں مخمل کے
لہراتے ہوئے پردے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بابے صادق کا انداز مجھے چونکا گیا۔ میں جانتا
تھا کہ بابا صادق ایک بھلا آدمی ہے۔ وہ چوہدری ارباب کا ملازم تھا اور یہاں حویلی میں
اس کا پایا جانا قابلِ فہم تھا، پھر بھی بابے کا انداز غور طلب محسوس ہو رہا تھا۔

کھانا آنے والا تھا۔ دسترخوان بچھایا جا رہا تھا۔ تلے ہوئے گوشت اور باسمتی
چاول کی خوشبو اطراف میں پھیلی ہوئی تھی، میں ہاتھ دھونے کے بہانے بیٹھک سے اٹھ

آیا، پھر تیزی سے گھوم کر بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ بابا صادق اسی طرف گیا تھا لیکن اب وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں چوہدری کا ایک مسلح کارندہ پھاٹک کی طرف رخ کیے کھڑا تھا اور کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

مجھے بابا صادق تو نظر نہیں آیا لیکن یوں باہر نکلنے سے مجھے ایک خاص بات کا پتا ضرور چل گیا۔ حویلی کی ڈیوڑھی میں کھڑی سرخ کار شاید تھوڑی دیر میں کہیں روانہ ہونے والی تھی۔ دراصل جب میں بابے صادق کی تلاش میں نظر دوڑانے کے بعد واپس بیٹھک کی طرف جانے لگا تو اچانک میری نگاہ سرخ کار کی طرف اٹھ گئی۔ چوہدری ارباب کا ایک دراز قد ملازم دو رائفلیں اور ایک تھرماس کار میں رکھ رہا تھا۔ تھرماس میں ظاہر ہے کہ چائے یا کافی وغیرہ ہوگی۔

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ لوگ کہیں شکار وغیرہ پر جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی میں نے انہیں رات کے وقت ہی شکار پر دیکھا تھا۔ بہر حال یہ صورت حال غور طلب بھی تھی۔ باغ پور اور ارد گرد کے علاقے میں خوف و ہراس کی فضا تنی ہوئی تھی۔ لوگ سرِ شام ہی گھروں میں بند ہو گئے تھے۔ ایسے ماحول میں شکار اور تفریح کے لیے نکلنا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔

میں کسی سے کوئی سوال کے بغیر بیٹھک میں واپس آ گیا۔ یہاں ملازم کھانا چن چکے تھے۔ بڑا پُرتکلف مینو تھا۔ بھُنی ہوئی چانپیں، روسٹ کی ہوئی مرغیاں اور بطخیں اور دریا کی روہو مچھلی، ترکنڈا مچھلی کے بیسن لگے قتلے، بریانی، پراٹھے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ سویٹ ڈش کے طور پر گڑ کے اسپیشل چاول تھے۔ ان میں بادام، پستہ اور کشمش وغیرہ ڈالے گئے تھے۔ انگریز مہمانوں کے آگے شراب اور اس کے لوازمات بھی سجائے گئے تھے۔

کھانے کے دوران میں ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ سلویا مجھ سے مخاطب ہوئی اور میرے پروفیشن کے حوالے سے سوالات کرتی رہی۔ کھانے کے بعد بھی باہمی دلچسپی کے امور پر بات ہوتی رہی۔ میں انتظار ہی کرتا رہا کہ چوہدری ارباب علی یا اس کے مہمانوں کی طرف سے کوئی بتائے گا کہ وہ لوگ ڈنر کے بعد کہاں روانہ ہو رہے ہیں لیکن ان میں

سے کسی نے اس موضوع پر زبان نہیں کھولی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس بات کو جان بوجھ کر گول کیے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں کیوں، ان کا یہ رویہ مجھے شک میں مبتلا کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد ہم ساتھ والے ہال کمرے میں آ بیٹھے۔ یہاں سرخ قالین تھا اور چاروں طرف گاؤ تکیے لگے تھے۔ شوکت نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے معنی خیز اشارہ کیا۔ شوکت کا اندازہ درست تھا۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک خوش جمال، نوخیز، رقاصہ چھم سے اندر آ گئی۔ ساتھ میں دو چار سازندے بھی تھے۔ ذرا ہی دیر میں نوخیز رقاصہ کا جسم سازوں کی سنگت میں نگاہوں کے سامنے بجلیاں گرانے لگا۔ وہ سخت سردی میں بھی باریک اور ناکافی لباس پہنے ہوئے تھی۔ لباس کے اندر سے بھی اس کے جسم کی گلابی رنگت نمایاں تھی۔ گریبان بہت کشادہ تھا اور وہ اس کشادگی کو رقص کے دوران بڑے غلط طریقے سے استعمال کر رہی تھی۔ انگریز حضرات بھی لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن میں نے سلویا کے چہرے پر سنجیدگی اور بیزاری کے آثار دیکھے۔ تاہم اس ہیجان خیز رقص کے بعد ایک بانسری نواز نے حاضرین کو ایک خوبصورت لوک دھن سنائی۔ اس دھن کو سلویا سمیت سارے مہمانوں نے پسند کیا۔ بلکہ دوبارہ سنا۔ یہ دھن اس طرز پر تھی جس پر ہیر وارث شاہ پڑھی جاتی ہے۔

بانسری نواز کی پرفارمنس کے دوران میں ہی چھت پر ایک کھٹکا سا سنائی دیا پھر دھم دھم کی آواز چند مرتبہ آئی۔ میں نے دیکھا کہ چوہدری ارباب کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا ہے۔ ان لمحوں میں چھوٹا چوہدری یعنی عالمگیر بھی ایک دم مضطرب دکھائی دیا۔ ایک لمحے کے لیے باپ بیٹے کی نگاہ ملی پھر عالمگیر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میرے علاوہ شاید کسی نے بھی یہ صورت حال نوٹ نہیں کی تھی۔ دیگر حاضرین کے علاوہ شوکت کی ساری توجہ بھی بانسری نواز کی طرف تھی۔ عالمگیر کے باہر جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد آواز آنا بند ہوگئی۔

رات تقریباً گیارہ بجے یہ محفل اختتام کو پہنچی۔ ہم چوہدری ارباب اور اس کے مہمانوں سے اجازت لے کر حویلی سے نکل آئے۔ عالمگیر ہمیں پھاٹک تک چھوڑنے آیا۔ ہمارا رخ اب گھر کی طرف تھا۔ گلی دور تک تاریک اور سنسان تھی۔ یخ بستہ سردی نے ہر

شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ہمارے معدوں میں گرما گرم مچھلی تھی شاید اسی لیے سردی کچھ کم محسوس ہو رہی تھی۔ کہیں پاس ہی سے ٹھیکری پہرے والوں کی صدا سنائی دے رہی تھی...... جاگدے رہنا...... خبردار...... جاگدے رہنا بھائیو!

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''شوکے یار! مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ آج رات چوہدری اور اس کے مہمان پھر کہیں نکل رہے ہیں......''

''کیا مطلب ہے؟''

میں نے شوکت کو بتایا کہ کس طرح میں ہاتھ دھونے کے بہانے باہر ڈیوڑھی کی طرف گیا تھا اور کس طرح وہاں میں نے سرخ کار کو تیاری کی حالت میں دیکھا۔

''لیکن چوہدری یا عالمگیر نے ہم سے تو کوئی ذکر نہیں کیا۔''

''یہی بات غور کرنے والی ہے۔ انہوں نے دنیا جہان کی باتیں کی ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں کہیں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

پھر میں نے شوکت کو ان آہٹوں کے بارے میں بھی بتایا جو چھت کی طرف سے آئی تھیں اور جنہیں سننے کے بعد عالمگیر فٹافٹ باہر نکل گیا تھا۔ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی موجودہ صورتِ حال میں اس پر غور کرنا پڑ رہا تھا۔ شوکت نے بتایا کہ اس نے بھی چھت سے ابھرنے والی مدھم آوازیں سنی تھیں۔

''یار شوکت! کیوں نہ دیکھا جائے کہ یہ لوگ کہاں جاتے ہیں؟''

''اگر چوہدری کو پتا چل گیا تو بڑا بدظن ہو جائے گا۔''

''بھئی! موجودہ حالات میں گشت پر رہنا تمہاری ذمے داری ہے۔ یہ ذمے داری نبھاتے ہوئے تم کسی بھی وقت، کہیں بھی پائے جا سکتے ہو۔''

لگتا تھا کہ میری بات شوکت کے دل کو لگی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود بھی اسی انداز سے سوچ رہا ہو۔ ہم دونوں کی سوچ اکثر مل جاتی تھی۔

گھر کی طرف جاتے جاتے شوکت نے اپنا رخ تھانے کی طرف موڑ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے میرا مشورہ قبول کر لیا ہے۔ ایک تنگ گلی سے گزر کر ہم اس کشادہ راستے پر پہنچ گئے جس پر تھانا واقع تھا۔ اندر کے دو کمروں میں لالٹین کی مدھم روشنی جھلک دکھا رہی

تھی۔ دو سنتری کمبل لپیٹے آگ جلائے بیرونی دروازے کے پاس ہی ایک چھپر کے نیچے بیٹھے تھے۔ اے ایس آئی نذیر رات کی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ پہاڑ جیسی رات گزارنے کے لیے اس کے پاس گرم انگیٹھی تھی، ایک ٹرانزسٹر ریڈیو تھا، اور باسی اخبار تھا۔ شوکت کو اچانک تھانے میں دیکھ کر وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور سلیوٹ کیا۔

''خیریت تو ہے جناب؟''

''خیریت ہی ہے۔ تم مشکی اور چتکبرے پر کاٹھی ڈالو۔ ہم نے کہیں جانا ہے۔''

''لیکن اس وقت جناب!'' نذیر نے قدرے حیرت سے کہا۔

''ہاں اسی وقت...... تم گھوڑے تیار کرو۔'' شوکت نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

گھڑ سواری میرا بھی پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میں لاہور میں بھی کسی نہ کسی طور یہ شوق پورا کر لیا کرتا تھا۔ ہم نذیر کی دہکائی ہوئی انگیٹھی کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم دونوں خاموش تھے لیکن ذہن میں ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے۔ کیا واقعی چوہدری ارباب علی اور اس کے انگریز مہمان کوئی خاص بات چھپا رہے ہیں؟ کیا باغ پور میں ہونے والے پے در پے حادثات اور ان مہمانوں کے درمیان کوئی تعلق ہے؟

دو روز پہلے شوکت نے حویلی کے اندر سے جو نسوانی چیخیں سنی تھیں وہ بھی ابھی تک ایک معما تھیں۔ کیا حویلی کے اندر کسی کو حبس بے جا میں رکھا گیا تھا؟ آج چھت پر سے ابھرنے والی آوازیں سن کر چوہدری اور اس کا بیٹا کیوں چونکے تھے؟ اس قسم کے کئی سوال ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

آج چوہدری کے مہمان مسٹر جیکب کی باتیں میں نے بڑے دھیان سے سنی تھیں اور یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ جیکب بین السطور کیا کہہ رہا ہے۔ مغربی ممالک کے باشندوں کو اکثر روشن خیال اور حقیقت پسند سمجھا جاتا ہے مگر جیکب نے باغ پور کے حالات کے بارے میں جس قسم کی گفتگو کی تھی وہ حقیقت پسندی سے ہٹ کر تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی ان واقعات کو پُراسرار اور ناقابلِ فہم قرار دے رہا ہے۔ کیا واقعی وہ ایسا سمجھ رہا تھا یا پھر ہماری الجھن کو مزید بڑھانا چاہتا تھا۔

ابھی میں شوکت سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول اٹھا۔ ''مجھے تو گورا صاحب

(جیکب) کی باتوں سے ایسا لگا ہے کہ وہ ہمیں خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے کہ یہ قتل کی سیدھی سادی وارداتیں نہیں ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی ایسی چیز ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے...... اور جو ہمیں نانی پڑنانی یاد دلا سکتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم شکل سے اتنے ہی اُلو نظر آتے ہیں۔''

''اپنے بارے میں تو مجھے تسلی ہے کہ میں ایسا نظر نہیں آتا، لیکن تم دیہاتی تھانوں میں رہ کر کچھ بدھو سے ضرور لگنے لگے ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ گورا بابا ندر ہمیں واقعی بنانے کی کوشش کر رہا تھا تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ کیا وہ صرف شغل کر رہا تھا یا اس کے پیچھے کوئی مقصد تھا۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ زیادہ تر دیہاتی کمزور عقیدے کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن ان میں بھی جو سمجھدار ہیں وہ ان اوٹنگی بونگی باتوں پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دو خون ہوئے ہیں۔ دو جیتے جاگتے انسان مارے گئے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے یارا!''

''دیکھیے، آگے آگے ہوتا ہے کیا؟'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں دو گھوڑے تھانے کے صحن میں پہنچ گئے۔ ایک مشکی رنگ کا، دوسرا چتکبرا تھا۔ دونوں پر زینیں کسی ہوئی تھیں۔ میں نے چتکبرے گھوڑے کو تھپکی دی اور اس پر سوار ہو کر دیکھا۔ شوکت کے کان مسلسل باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ حویلی یہاں سے بہت دور نہیں تھی۔ ہمیں پتا تھا کہ جونہی سرخ کار اسٹارٹ ہو کر گلی میں پہنچی ہمیں اس کی آواز سنائی دے جائے گی کار کی آواز سنتے ہی ہمیں بھی فوراً سوار ہو کر تھانے کے احاطے سے نکل جانا تھا۔

شوکت نے اے ایس آئی نذیر سے کہا کہ وہ حوالدار فدا حسین کو گلی میں بھیج دے تا کہ جونہی سرخ کار حویلی سے نکلے وہ ہمیں اطلاع دے دے۔

نذیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جناب فدا حسین تو چار بجے ہی گھر چلا گیا تھا۔ اسے سردی کے ساتھ بخار ہو رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ بہانہ بنا رہا تھا۔ بس وہ ڈرا ہوا ہے۔''

نذیر نے ہیڈ کانسٹیبل شمشاد کو باہر بھیج دیا...... اور مزید احتیاط کے طور پر خود بھی گلی میں ٹہلنے نکل گیا۔ شوکت نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا اور انگیٹھی کی ایک جلتی

لکڑی سے سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''وہ میم بڑے غور سے دیکھ رہی تھی تیری طرف...... لگتا ہے کہ اس دن کے واقعے کا اس پر کافی اثر ہوا ہے۔''

''کس واقعے کی بات کر رہے ہو؟''

''زیادہ بھولے بادشاہ نہ بنو۔ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ کھیتوں میں میم جب بابے صادق سے ڈر کر بھاگی تھی تو ''ٹھاہ'' کر کے تمہارے سینے سے آ لگی تھی۔ بلکہ لپٹ ہی گئی تھی۔''

''بڑی حسرت ٹپک رہی ہے تمہارے لہجے سے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں یار، میں تو تمہاری قسمت پر رشک کر رہا ہوں۔''

''اس طرح کا رشک کرنا ہے تو پھر بابے صادق پر کرو۔ اس ''جوان بڈھے'' نے بے چاری کو نیچے گرایا۔ اس کو قابو کیا اور اچھے خاصے رگڑے بھی دیے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ بابا اندر سے بڑی پہنچی ہوئی شے ہے۔ سلویا کو مٹی میں رگیدنے کے بعد جب وہ بری طرح لتھڑ گئی تو پھر وہ بڑے ''ذوق وشوق'' سے اس کی پینٹ جھاڑنے لگا۔''

شاید ابھی ہم اس بارے میں مزید گفتگو کرتے لیکن اسی دوران میں گلی کے آخری سرے پر انجن کا مدھم شور سنائی دیا۔ اے ایس آئی نذیر تیزی سے اندر آیا اور اس نے بتایا کہ گاڑی حویلی سے نکل رہی ہے۔

شوکت نے اپنا ہولسٹر تھپتھپا کے ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کیا، پھر اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم گاؤں کی تاریک گلی میں یخ بستہ سردی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دور فاصلے پر کار کی عقبی لال بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں ان ہچکولے کھاتی بتیوں کو نگاہ میں رکھنا تھا اور ان کے پیچھے جانے کی کوشش کرنا تھی۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ گھوڑوں پر سرخ کار کا تعاقب اتنا آسان ثابت ہو گا۔ دراصل راستہ کچا اور ناہموار تھا۔ گاؤں کی گلیوں سے نکلنے کے بعد بھی کار کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہو سکی۔ ہم محفوظ فاصلہ رکھ کر بآسانی کار کا تعاقب کرتے رہے۔ گھوڑے اچھی طرح سدھائے ہوئے تھے اور اونچے نیچے تاریک راستے پر چلنے کا خاطر خواہ تجربہ رکھتے تھے۔

گاؤں سے تقریباً ایک میل باہر آنے کے بعد ایک عمارت کے آثار نظر آئے۔ دراصل یہ گاؤں کا پرانا اسکول تھا۔ چند سال پہلے سیلاب کی وجہ سے اس اسکول کی عمارت کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ اس نقصان کے بعد ٹوٹی ہوئی دیواروں اور بیٹھی ہوئی چھتوں کے درمیان درس و تدریس کا سلسلہ کسی نہ کسی طور جاری رہا تھا مگر پھر دو ڈھائی سال مزید گزرنے کے بعد یہ عمارت بالکل کھنڈر بن گئی تھی۔ اب نیا اسکول گاؤں کے بالکل قریب واقع تھا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کار کا رخ اسکول کے کھنڈر کی طرف ہے۔ ہماری توقع کے عین مطابق کھنڈر کے قریب پہنچ کر کار رک گئی۔ یہاں تین اطراف میں خودرو جھاڑیاں تھیں، ایک طرف کھیت تھے۔ ہم نے بھی گھوڑے محفوظ فاصلے پر روک دیے...... اور پھر کچھ دیر تک انتظار کے بعد انہیں درختوں سے باندھ دیا۔

گاڑی کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ ثابت ہو رہا تھا کہ کار سواروں کی منزل یہی ہے۔ ہم دونوں پوری طرح چوکس اور حالات کے لیے تیار تھے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں نزدیک جانا چاہیے۔'' شوکت نے سرگوشی کی، میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ درختوں کی اوٹ میں چلتے ہم کماد کے چھ سات فٹ اونچے کھیت میں پہنچے اور پھر مزید احتیاط سے کھنڈر کی طرف بڑھنے لگے۔ کھیت میں چلنے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ رات کا وقت ہو تو آواز نمایاں تر ہو جاتی ہے لیکن اس روز چونکہ ہوا چل رہی تھی لہٰذا ہم آسانی سے آگے بڑھتے رہے اور کھنڈر کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ چند ہیولے بڑے محتاط انداز میں شکستہ عمارت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس بات میں شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ کار سے برآمد ہونے والے افراد ہیں۔

ہم بڑی محفوظ جگہ پر تھے۔ کھنڈر سے نزدیک ہونے کے باوجود ہمارے دیکھے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ تقریباً سات فٹ اونچی فصل کے درمیان کھڑے ہم اطمینان سے کار سواروں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ ایک مقام پر آ کر ٹھہر گئے تھے۔ اندازہ ہوا کہ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔ دراز قد جیکب ان میں

نمایاں نظر آ رہا تھا۔ ایک فربہ شخص کے کندھے پر جھولتی ہوئی گن بھی دکھائی دی۔ مجھے شک گزرا کہ یہ شکاری رازی جان ہے۔ سلویا بھی ان لوگوں کے ساتھ تھی لیکن مجھے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ بس دو تین بار اس کی باریک آواز ہی میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ عجیب سا لوچ اور الھڑ پن تھا اس کی آواز میں۔

پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں نہ چاہنے کے باوجود سلویا کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں نے اس سے پہلے کوئی انگریز لڑکی ہی نہیں دیکھی تھی لیکن اس بات کا اعتراف کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ عام یوروپین سے بہت مختلف تھی۔ اس کے طور اطوار میں مشرقیت جھلکتی تھی۔ اس کے شرمانے کا انداز بھی مشرقی تھا۔

اس کیفیت میں اس کے کان سرخ ہو جاتے تھے اور ہلکی نیلی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے ذہن سے ابھی تک وہ لمحات نکل نہیں سکے تھے، جب وہ اپنے جسم کی تمام تر جولانی اور حشر سامانی کے ساتھ مجھ سے پیوست ہو گئی تھی۔ بعد ازاں اس کے جھینپنے کا انداز بھی اس کے لمس ہی کی طرح دلکش ثابت ہوا تھا۔ اب بھی میں تاریکی میں گاہے گاہے اس کی آواز سن رہا تھا۔ جب بھی یہ آواز سماعت سے ٹکراتی تھی۔ دل میں کھدبدی ہونے لگتی تھی۔

قریباً دس منٹ تک ہم اسی طرح ٹھہرے ہوئے کھیت میں کھڑے رہے پھر ہم نے دیکھا کہ کار سواروں میں سے دو افراد جھک کر چلتے ہوئے مختلف اطراف سے کھنڈر کی طرف بڑھے۔ سلویا سمیت باقی تین افراد نہیں نظر آ رہے تھے لیکن یقینی بات تھی کہ وہ آس پاس ہی موجود ہیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے کھنڈر سے باہر ہی پوزیشن لے رکھی ہے۔ کھنڈر کی طرف بڑھنے والے دونوں افراد بے حد محتاط نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ہر قدم پھونک کر رکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ ٹارچوں کے روشن دائرے کھنڈر کی بیرونی دیواروں کے مختلف حصوں کو چمکا رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان دونوں ٹارچ برداروں میں ایک جیکب ہے کچھ دیر تک ٹارچوں کے روشن دائرے اِدھر اُدھر حرکت کرتے رہے، پھر کھنڈر کے اندر پہنچ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دونوں افراد کھنڈر کے اندر داخل ہو گئے تھے۔

''کوئی لمبا چکر لگ رہا ہے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

شوکت نے ہنکارا ابھرا۔ اس کا دایاں ہاتھ بے دھیانی میں بار بار ہولسٹر کو چھوتا تھا۔

صبر آزما لمحات تھے۔ کڑاکے کی سردی میں بھیگے بھیگے کھیت کے اندر کھڑے ہمار
ٹانگیں اکڑنے لگی تھیں۔ رات کے وقت کھیتوں کے اندر حشرات کا ڈر رہتا ہے۔ ظاہر ہ
کہ ان حشرات میں ''دشمن جاں'' سانپ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی قسم کے
زہریلے کیڑے، مزاج پُرسی کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ ہم نے یہ سارے خطرات مول لے
رکھے تھے اور نتیجے کا انتظار کر رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ا
پُراسرار ڈرامے میں ہمارا کردار کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو اب ہم پر تقریباً واضح ہو چکی تھ
کہ یہاں کوئی سنگین قسم کا گڑبڑ گھوٹالا ہے۔ نوے فیصد امکان تھا کہ چوہدری کے انگر
مہمان بھی اس گڑبڑ گھوٹالے میں ملوث ہیں۔ اب یہ گڑبڑ گھوٹالا کس قسم کا تھا؟ اس بار
میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ اس سارے چکر کا تعلق
بشیرے اور صغراں کے قتل سے ہو۔ اگر ایسا تھا تو پھر یہ معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا تھا۔ مج
چند دن پہلے کا وہ واقعہ رہ رہ کر یاد آ رہا تھا جب میں نے رات آخری پہر چھوٹے چوہدر
اور اس کے انگریز مہمانوں کو کھیتوں میں گھومتے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی یہی محسوس ہوا
کہ وہ لوگ کچھ ڈھونڈ رہے ہیں...... آخر وہ کیا ڈھونڈ رہے تھے؟

''میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ اور آگے جانا چاہیے۔'' شوکت نے سرگوشی کی۔

''تو چلو، جب ''اوکھلی'' میں سر دے لیا ہے تو پھر ڈر کس بات کا۔''

ہم دونوں احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ آخری چند گز کا فاصلہ ہمیں چوپایوں
طرح چل کر طے کرنا پڑا۔ آخر ایک جگہ ہم اوندھے منہ ٹھنڈی ٹھار زمین پر لیٹ گئے۔ بھیگ
ہوئی مٹی کی خوشبو، فصل کی خوشبو سے بغل گیر ہو کر ہمارے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ د
مردانہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ سلویا کے انگریز ساتھی تھے۔ سلویا بھی پاس
موجود تھی۔ ایک بار اس نے ہارڈی کا نام لے کر کچھ کہا۔ دوسری مرتبہ وہ دبے ہوئے ل
میں بولی ''اف...... میرے پاؤں پر کچھ رینگ رہا ہے۔''

یہ آوازیں ہم سے فقط دس پندرہ گز دور تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہم دونوں م

سے کسی کو کھانسی یا چھینک آ جائے تو فوراً سے پہلے ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے۔ سناٹے میں
اپنے سانسوں کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس سے آگے بڑھنا ہمارے لیے
بالکل مناسب نہیں تھا لہٰذا وہیں دبک کر لیٹے رہے۔

☆=====☆=====☆

ایک سایہ سا ہمارے سامنے لہرایا اور بڑی احتیاط سے کھنڈر کی طرف چلا گیا۔ غالباً
یہ سلویا کے دو ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ ذرا دیر بعد سلویا کی بیزار سی آواز کانوں میں
پڑی۔ ''ہارڈی! مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ پلیز، نہ کیا کرو ایسا۔''

''میں نے کیا کر دیا ہے؟'' ہارڈی نے مدھم آواز میں کہا۔

''تم جانتے ہو تم نے کیا، کیا ہے۔'' سلویا کے لہجے میں بہ دستور خفگی تھی۔

''یعنی میرا ہاتھ لگانا بھی تمہیں اچھا نہیں لگتا۔''

''نہیں لگتا۔'' ہارڈی کو روکھا جواب ملا۔

''تم زیادتی کر رہی ہو ڈارلنگ!'' ہارڈی نے غالباً مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ تمہارے متعلق۔'' سلویا نے ترت جواب دیا۔

اس گفتگو سے صاف پتا چل رہا تھا کہ سلویا اور ہارڈی میں کس قسم کے تعلقات ہیں۔

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں مزید گفتگو ہوتی۔ کھنڈر کی طرف سے ایک نہایت
کرب ناک چیختی ہوئی آواز بلند ہوئی اور سناٹے کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ اس دل دہلا دینے
والی آواز کے ساتھ ہی کسی نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ سلویا اور ہارڈی دکھائی
دیے۔ وہ ہمارے بالکل سامنے فصل میں دبکے ہوئے تھے، اب ایک دم بے تاب ہو کر
کھڑے ہو گئے تھے۔ اس دوران میں تھری ناٹ تھری کا ایک فائر اور سنائی دیا۔ سلویا کی
چلاتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی۔ ''وہ رہا...... وہ دیکھو...... وہ جا رہا ہے۔'' اس کے
ساتھ ہی اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ ہم نے بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن جہاں
ہم کھڑے تھے وہاں سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

''وہ دیکھو۔ لگتا ہے کہ وہ جیکب ہے۔'' شوکت نے میرے کان میں سرگوشی کرتے
ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔

یقیناً وہ لمبا تڑنگا جیکب ہی تھا۔ وہ بھاگتا ہوا اسکول کے کھنڈر سے نکلا۔ سرخ کار پہلے ہی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ وہ چلتی ہوئی کار میں بھاگ کر بیٹھا۔ کار کچی زمین پر دھول اڑاتی ہوئی تیزی سے دائیں جانب روانہ ہوگئی۔ کار کی عقبی سرخ بتیاں بری طرح ہچکولے کھا رہی تھیں۔ ان ہچکولوں سے کار کی تیز رفتاری کا پتا چلتا تھا۔

ہم دونوں اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا کرنا چاہیے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ سلویا اور ہارڈی بھی کار میں بیٹھ گئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کار کافی دور نکل گئی۔ اب ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ گھوڑوں تک پہنچتے، انہیں کھولتے اور کار کے پیچھے جانے کی کوشش کرتے۔ کار کی عقبی روشنیاں اب مدھم نظر آ رہی تھیں اور انجن کی آواز بھی خاصے فاصلے سے سنائی دیتی تھی۔ ہم کچھ دیر تک سن گن لیتے رہے۔ آس پاس کوئی آہٹ نہیں تھی۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکال لی لیکن اسے روشن نہیں کیا۔ شوکت نے ریوالور ہولسٹر سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد ہم بڑے دھیمے اور محتاط قدموں سے کھنڈر کی طرف بڑھے۔

کھنڈر کے اندر پہنچے تو شکستہ عمارتوں کی مخصوص بو باس نتھنوں میں گھسنے لگی۔ ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے درمیان کئی جگہ کائی اگی ہوئی تھی۔ کچھ دیواریں اب بھی خاصی بلند تھیں۔ میں نے ٹارچ جلالی۔ ٹارچ کی روشنی کھنڈر کے اندر گردش کرنے لگی اور ہم بڑے چوکنے انداز میں دیواروں کے درمیان گھومنے لگے۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ان دیواروں کے درمیان ضرور کچھ نہ کچھ معمول سے ہٹ کر ہے۔

اچانک میں نے کار کے انجن کی مدھم آواز سنی۔ میں نے شوکت کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ بند کر دی۔ ایک دیوار کی اوٹ سے ہم نے دیکھا تو خدشہ درست نکلا۔ کار کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ وہ سرخ کار تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ آندھی کی رفتار سے گئی تھی لیکن اب نسبتاً دھیمی رفتار سے واپس آ رہی تھی۔ ڈیڑھ دو منٹ میں کار کھنڈر کے عین سامنے پہنچ گئی۔ انجن آف کر دیا گیا۔ لائٹس بجھا دی گئیں پھر دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔

ہم اپنی جگہ دبکے رہے اور محسوس کرتے رہے کہ وہ لوگ اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔

گاہے گاہے ان کی دبی دبی آوازیں بھی سماعت تک پہنچتی تھیں۔ سلویا کی کھنکتی ہوئی آواز بھی ان میں شامل تھی۔ کم از کم چار ٹارچوں کی روشنیاں کھنڈر کے آس پاس گردش کر رہی تھیں۔ مجھے وہ فقرہ یاد تھا جو کچھ دیر پہلے سلویا نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے کسی بھاگتے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا تھا اور اپنے ساتھیوں کو اس کے بارے میں خبردار کیا تھا۔ ہم اس بھاگنے والے کو دیکھ ہی نہیں سکے تھے لیکن قرائن سے پتا چل رہا تھا کہ یہ لوگ سی ''بھاگنے والے'' کی تلاش میں یہاں پہنچے ہیں۔ وہ کون تھا؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

شوکت نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید ان لوگوں کو شک ہے کہ ''بھاگنے والا'' انہیں چکما دے کر پھر سے کھنڈر میں آ گیا ہے۔''

''میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا ''اور اس کے علاوہ ایک اور بات بھی محسوس کر رہا ہوں۔''

''وہ کیا؟'' شوکت نے کہا۔

''وہ لوگ دوبارہ کھنڈر کے اندر آنے سے کترا رہے ہیں۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' شوکت نے جوابی سرگوشی کی۔

''کیا ارادے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔'' شوکت نے کہا اور خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ بہرحال ہم ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھے۔ موجودہ صورتِ حال میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں میں سے کوئی ہم پر فائر بھی کھول سکتا تھا۔ یہ کوئی گہرا چکر لگ رہا تھا اور چوہدری بھی اس میں ملوث تھے۔ چھوٹا چوہدری یعنی جواں سال عالمگیر اب بھی ان کے ساتھ تھا۔ گاہے گاہے اس کی آواز بھی ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ شدید کشمکش کے عالم میں گزرے۔ ایک ہی جگہ ساکت کھڑے کھڑے ہماری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ بلکہ سردی کے سبب پورا جسم اکڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ بالآخر عالمگیر اور اس کے مہمانوں کی تلاش ختم ہوئی۔ انہوں نے کھنڈر کے گرد ایک آخری چکر لگایا۔ دو ہیولے دو چار قدم تک کھنڈر کے اندر بھی آئے۔ اس کے بعد وہ

لوگ واپس رخصت ہو گئے۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز بہ تدریج دور ہوتی چلی گئی۔ کار کا رخ واپس باغ پور کی طرف تھا۔

اب چاروں طرف گہری تاریکی اور مکمل سناٹا تھا۔ بس کسی وقت دور کسی جھاڑی میں کسی ٹھٹھرے ہوئے کتے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

ہم دونوں کھنڈر کے عین درمیان میں ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ گہرے اندھیرے میں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک سنسنی سی تھی جو شکستہ در و دیوار سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ٹارچ جلا لی۔ سرکاری ریوالور بہ دستور شوکت کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بڑی چوکنی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ ہم لمبی خودرو گھاس کے درمیان چلتے ہوئے آہستہ آہستہ کھنڈر سے باہر سے نکلنے لگے۔ ایک بدلی کی اوٹ سے آخری راتوں کے چاند نے ذرا دیر کے لیے جھلک دکھائی اور پھر غائب ہو گیا۔

ہم اسکول کے برآمدے میں سے گزر رہے تھے کہ ایک شے دیکھ کر اچانک ٹھٹک گئے۔ لمبی گھاس میں کوئی سیاہی مائل چیز پڑی تھی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ اس شے پر مرکوز کیا اور احتیاط سے آگے بڑھا۔ یہ کسی شخص کے فل بوٹ تھے پھر ٹارچ کا روشن دائرہ رینگتا ہوا دو انسانی ٹانگوں پر پڑا۔ دل یکبارگی شدت سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اپنے ہاتھ میں ٹارچ لرزتی محسوس ہوئی۔ روشن دائرہ کچھ مزید آگے سرکا اور ایک شخص کا چہرہ ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ یہ ایک مردہ شخص کا چہرہ تھا۔

''میرے خدا......!'' شوکت کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

ہمارے روبہ رو شکاری رازی جان کی لاش پڑی تھی۔ میں ہاتھ لگائے بغیر ہی بتا سکتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا سفر ختم کر چکا ہے۔ اس کے سانولے چہرے پر تشنج کی سی کیفیت تھی۔ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے یہی شخص حویلی میں رقص دیکھ رہا تھا، بانسری کی دھن پر واہ واہ کر رہا تھا اور کڑک چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اب وہ زندگی کی سرحد پار کر کے عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں کو یقین نہیں ہوا۔

ہم چند لمحے ساکت و جامد کھڑے رہے پھر شوکت نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''احتیاط رکھو۔ ہمیں کوئی ثبوت ضائع نہیں کرنا۔''

شوکت نے میرے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور ریوالور مجھے تھما دیا۔ لاش کے قریب بیٹھ کر اس نے بڑے دھیان سے معائنہ شروع کیا۔ پہلے واقعات کی طرح مرنے والے کی گردن پر کوئی نشان نہیں تھا لیکن اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ شوکت نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ آگے بڑھایا اور لاش کے سر کو حرکت دی۔ گردن عجیب بے ڈھنگے انداز سے ایک طرف ڈھلک گئی۔ ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ رازی جان کی گردن توڑی گئی تھی۔

ہم بے حد احتیاط کر رہے تھے کہ قدموں کے نشان ضائع ہونے نہ پائیں۔ شوکت نے لاش کے اردگرد کی شہادتیں اور علامتیں نوٹ کر لیں او مجھے بھی کرا دیں۔ شوکت نے رازی جان کی جیبیں ٹٹولیں۔ جرسی کے نیچے قمیص کی جیب سے پانچ چھ سو کے کرنسی نوٹ نکلے۔ ایک جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس برآمد ہوئی۔ پتلون کی پاکٹ سے چند بوسیدہ کاغذات ملے انہیں پولی تھین میں لپیٹا گیا تھا۔ رائفل کا لائسنس بھی ان میں شامل تھا۔ تاہم رائفل کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

ایک عجیب سی سنسنی نے مجھے اور شوکت کو جکڑ لیا تھا۔ خاص طور سے میں خود کو بے حد ''پزل'' محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اَن دیکھا خوف بھی اعصاب کو جکڑتا چلا جا رہا تھا۔ اب تک باغ پور اور گردونواح میں جتنی بھی افواہیں اور خبریں گردش کرتی رہی تھیں، وہ سب کی سب ایک شور کے ساتھ دماغ میں گونج رہی تھیں۔

ان سنسنی خیز لمحات میں موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے جو مختصر سا خاکہ ذہن میں آ رہا تھا، وہ کچھ اس طرح تھا۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری ارباب علی اور اس کے غیر ملکی مہمان یہاں باغ پور میں کوئی ''کھیل'' کھیل رہے ہیں۔ شکاری رازی جان بھی اس پُراسرار کھیل کا ایک مہرہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چوہدریوں کے لیے کرائے پر کام کر رہا ہو۔ اس کی جیب سے برآمد ہونے والے کرنسی نوٹوں سے بھی اس بات کا اشارہ ملتا تھا۔ یہاں کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا، اس بارے میں کئی طرح کے امکانات ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ دو گروہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوں۔ کسی خاص مقصد کے تحت وہ ایک دوجے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی نامعلوم شخص کو پکڑنے کے لیے تینوں غیر ملکی حضرات ارباب علی کے ساتھ مل کر کوشش کر رہے ہوں۔ یہ شخص باغ

پور کا ہو سکتا اور باغ پور سے باہر کا بھی۔ عجیب الخلقت جانور والی بات بھی بار بار ذہن میں
آ رہی تھی۔ بہرحال اس بات کا قوی امکان تھا کہ بشیرے اور صغراں کا قتل اسی سلسلے کی
کڑیاں ہیں۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ رازی جان ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے قتل ہوا ہے اور
چوہدری اس قتل سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس کے باوجود وہ رازی کی لاش چھوڑ کر
واپس چلے گئے۔ انہوں نے لاش کو چھپانے یا اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔
حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ جانور لاش کو خراب کر سکتے ہیں۔

اچانک...... بالکل اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی ہمارے عقب میں موجود ہے۔
کوئی ذی روح، کوئی سانس لیتا ہوا جسم۔ سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ
گئی۔ ایک سیکنڈ کے لیے میرے ذہن میں ''مافوق الفطرت'' کا خوف جاگا پھر میں نے
ایک جھٹکے سے اپنا رخ پھیرا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ ایک متحرک جسم پر پڑا۔ یہ جسم شوکت پر
حملہ آور ہوا تھا۔ شوکت ایک مضبوط اور سخت جان شخص تھا۔ اس کا وزن 80 کلو سے کم نہیں
رہا ہوگا۔ میں نے اسے لکڑی کے پتلے کی طرح اچھل کر کھنڈر کی دیوار سے ٹکراتے دیکھا۔
شوکت کے حلق سے ایک دل دوز کراہ نکلی۔ دیوار کی کچھ اینٹیں اکھڑ کر دور جا گریں، میں
نے شوکت کو اوندھے منہ زمین پر گرتے پایا۔ شوکت کے حلق سے نکلنے والی آواز نے ایک
لحظے کے اندر مجھے سمجھا دیا تھا کہ اسے کافی چوٹ لگی ہے۔ وہ بے ہوش ہو گیا ہے یا کچھ دیر
کے لیے بے کار ہو گیا ہے۔ شوکت کے ہاتھ سے ٹارچ لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی تھی۔ اس کی
آڑی ترچھی روشنی ایک جسم پر پڑ رہی تھی لیکن کیا وہ واقعی ایک جسم تھا۔ میری آنکھیں کھلی
تھیں اور رگ و پے میں سردی کی ایک تیز لہر دوڑ رہی تھی۔ یہ قیامت کے لمحے تھے۔ چند
لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مجھے لگا جیسے میں ایک درخت ہوں۔ مجھے
میری زمین سے جدا کر کے، میری جڑوں سے اکھاڑ کر یخ بستہ پانی میں پھینک دیا گیا ہے۔
میرا یقین، میرا ایمان، میری جرأت، میری روشن خیالی، سب کچھ ایک گھٹا ٹوپ تاریکی
میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ میں بہ قائمی ہوش و حواس اپنی کھلی آنکھوں سے ایک مافوق العقل
چیز کو دیکھ رہا تھا۔ شاید میرے الفاظ میری کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر رہیں۔ آدھی
رات کا عمل، ایک ویران کھنڈر، مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر میرے ساتھی کا بے حرکت

جسم اور میرے سامنے ایک ناقابلِ فہم ہیولا...... آڑی ترچھی پڑی ٹارچ کی زرد روشنی میں
نظر آنے والا جسم (میں اسے جسم ہی کہوں گا) تقریباً پانچ فٹ بلند تھا۔ سر عام انسانی سر
سے تقریباً ڈھائی گناہ بڑا تھا اور ایک طرف سے دبا ہوا نظر تھا۔ اس کے زیریں بدن پر کوئی
نیکر نما شے تھی۔ اس کے چہرے کے سوا سارے بدن پر لمبے بال دکھائی دے رہے تھے۔
اس کی ٹانگیں صرف دو تھیں لیکن میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بازو چار تھے۔
اس جسم کی آنکھیں بالکل گول تھیں اور بھدے موٹے ہونٹوں کے درمیان سے سفید دانت
جھانک رہے تھے۔

زبیدہ کا بیان کا ایک بازگشت کی طرح میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ یہ ناقابلِ
یقین بیان آج کم و بیش ایک ناقابلِ تردید حقیقت بن گیا تھا اور یہ ''حقیقت'' مجھ سے پانچ
قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔ سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ چند لمحے تک سکتے
میں رہنے کے بعد، میں ایک جھٹکے سے اپنے حواس میں آیا۔ حواس میں آنے کے بعد مجھے
پہلا احساس یہی ہوا کہ میں اپنی زندگی کے شدید ترین خطرے سے دوچار ہوں۔ آنے
والے چند سیکنڈوں میں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے بہ خوبی یاد ہے، ان لمحات
میں، میں اس امر کو بالکل فراموش کر چکا تھا کہ میرے دائیں ہاتھ میں 38 بور کا بھرا ہوا
ریوالور ہے اور میں اپنی شہادت کی انگلی کو ایک جنبش دے کر فائر کر سکتا ہوں۔ اس سے
پہلے کہ مجھے اپنے ہاتھ میں موجود آتشیں ہتھیار کا ادراک ہوتا اور میں اس ادراک سے
توانائی حاصل کرتا ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
یہ آواز اس متنفس کے سینے سے برآمد ہوئی تھی جو میرے سامنے موجود تھا۔

میرے پاس یہ نتیجہ نکالنے کی مہلت ہرگز نہیں تھی کہ جو خوفناک چہرہ مجھے گھور رہا
ہے۔ وہ انسان کا ہے، کسی درندے کا ہے، یا کسی ایسی مافوق الفطرت شے کا جس پر میں
نے کبھی یقین نہیں کیا۔ اسی دوران میں عجیب الخلقت وجود نے ایک قدم آگے بڑھایا۔
یہی لمحے تھے جب مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں ہاتھ میں جو ''سرد بوجھ'' ہے وہ شوکت
کے ریوالور کا ہے۔ ایسا ریوالور جو ایک روشن دھماکے سے پگھلا ہوا سیسہ اگل سکتا ہے مگر پھر
اس سے پہلے کہ میں فائر کرتا یا اپنے سامنے موجود انسان نما وجود کو کوئی ڈری ہوئی دھمکی

دیتا، وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور ناقابلِ یقین پھرتی اور طاقت سے میرے ساتھ لپٹ گیا۔ اس کے کریہہ لمس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ میرے سینے پر چوٹ لگی تھی۔ ایک کراہ سی میرے ہونٹوں پر آتے آتے رہ گئی۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈگمگا کر خودرو گھاس پر گرا۔ میرا دایاں ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ شاید وہ زمین پر پڑی ہوئی کوئی اینٹ تھی۔ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میرا جسم اس عجیب الخلقت ''چیز'' کے بوجھ تلے پسا جا رہا تھا۔

یکا یک میں نے محسوس کیا کہ دو کھردرے ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میری نگاہوں کے سامنے بشیرے، صغراں اور رازی جان کی لاشیں گھوم گئیں۔ ان سب کو گردن دبا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ تو کیا آج اس ویران رات کے ان ٹھٹھرے ہوئے لمحات میں میرا بھی یہی انجام ہونے جا رہا تھا؟ ایک اضطراری حرکت کے تحت میں نے دفاعی انداز میں ہاتھ اٹھائے اور دو بالوں بھری کلائیاں میرے ہاتھوں میں آ گئیں۔ کلائیوں کو تھامتے ہی مجھے مدِمقابل کی بے پناہ جسمانی طاقت کا اندازہ ہوا۔ اس کی گول آنکھیں اور سفید نوکیلے دانت میرے چہرے سے بالشت بھر کے فاصلے پر تھے۔ وہ سانس لے رہا تھا اور ہر سانس کے ساتھ تیز بو کے بھبکے میرے نتھنوں میں گھس رہے تھے۔ یہ عجیب حیوانی بُو تھی۔ حواس کو مختل کرتی ہوئی اور دماغ میں کراہت جگاتی ہوئی۔

اپنے جسم کا پورا زور لگا کر میں نے ان قاتل ہاتھوں کو اپنی گردن سے دور ہٹا دیا۔ اپنے مدِمقابل کو چھونے سے جہاں ایک کراہت آمیز خوف کا احساس ہوا تھا، وہاں تھوڑا سا، بہت تھوڑا سا اطمینان بھی محسوس ہوا تھا۔ اطمینان اس بات کا تھا کہ کچھ بھی ہے میرا مدِمقابل گوشت پوست کا جسم رکھتا ہے۔ وہ کوئی غیر مرئی چیز نہیں ہے۔

میں نے پوری قوت صرف کر کے مدِمقابل کی دونوں کلائیوں کو اوپر اٹھا دیا تھا۔ اب میری کوشش تھی کہ اس کے جسم کو اپنے اوپر سے اچھال دوں۔ میں لڑائی بھڑائی میں اناڑی نہیں تھا اور جسمانی طاقت میں بھی اوسط سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ لڑکپن، نوجوانی اور جواں سالی میں کئی بار اس قسم کی صورتِ حال سے پالا پڑا تھا اور مجھے کبھی ''خود سے'' مایوسی نہیں ہوئی تھی لیکن موجودہ پچویشن بالکل جدا تھی۔ ہراس اور بے یقینی کی کیفیت نے میری

توانائی کو نصف کر دیا تھا۔ دماغ میں دھند سی بھرتی جا رہی تھی۔ مدِمقابل کی اوپر کو اٹھی ہوئی کلائیاں ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھیں۔ دفعتاً ڈر کی ایک شدید لہر میرے سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ مجھے اپنے حواس پر اعتبار نہیں ہو رہا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ دو اور ہاتھ میری گردن کی طرف رینگ رہے تھے۔ ایک لمحے میں مجھے عزرائیل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ میں اپنے حریف کے دو زائد ہاتھوں کو فراموش کر چکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھوں سے ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ خوف اور بوکھلاہٹ کے عالم میں، میں نے پہلے ہاتھ چھوڑ دیے اور دوسرے پکڑ لیے لیکن اصل صورتِ حال یہ تھی کہ اب کسی ہاتھ پر میری گرفت نہیں رہی تھی۔ مدِمقابل آکٹوپس کی طرح سے میرے جسم کو جکڑ رہا تھا۔ دو ہاتھ میری کمر کو گرفت میں لیے ہوئے تھے اور دو ہاتھ جو نسبتاً کم طاقت ور محسوس ہوتے تھے میری گردن میں پیوست ہو رہے تھے۔ وہ انسان نما جانور وحشیانہ آوازیں نکال رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلنے لگی۔ سنا اور پڑھا تھا کہ جو لوگ دم گھٹنے سے ہلاک ہوتے ہیں انہیں بہت اذیت اٹھانی پڑتی ہے۔ آج قیامت کے ان لمحات میں اس کا عملی تجربہ ہو رہا تھا۔ ہوا میرے پھیپھڑوں سے بچھڑ گئی تھی اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں حلقوں سے ابل رہی ہیں۔ مجھے پتا چل رہا تھا کہ میں کھانسنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس کوشش میں میرے حلق سے بس گھر گھر کی آواز نکل رہی ہے۔ شاید یہ زندگی کے آخری لمحے تھے۔ میرے سامنے تاروں بھرا سیاہ آسمان تھا اور میرے جسم کے نیچے خودرو گھاس دبی ہوئی تھی۔ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا کہ رازی جان اور شوکت کی لاش کے ساتھ میری لاش بھی اس کھنڈر کے برآمدے میں پڑی ہے اور ہمارے چاروں طرف دیہاتیوں کا ہجوم ہے۔ سورج کی روپہلی کرنیں اس کھنڈر پر پڑ رہی ہیں اور اس اجالے میں ہماری موت کا ہر ہر منظر واضح ہو رہا ہے۔

ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں پوری طرح محسوس کر رہا تھا کہ مدِمقابل مجھ پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہے اور اب اس تاریک رات کے بطن میں میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

☆=====☆=====☆

اچانک ذہن میں اڈتی ہوئی بیکراں تاریکی کے درمیان ایک جگنو سا چمکا۔ مجھے

یاد آیا کہ میری پتلون کی جیب میں ایک چھوٹا چاقو موجود ہے۔ اس جیبی چاقو سے میں اور اے ایس آئی نذیر آج دوپہر مالٹے چھیلتے رہے تھے اور دھوپ میں بیٹھے کھاتے رہے تھے۔ اگر میرا ہاتھ کسی طرح اس چاقو تک پہنچ جاتا تو زندگی بچنے کا وسیلہ پیدا ہوسکتا تھا۔ مجھے اس ''زندگی بخش'' چاقو کی سختی اپنی دائیں ران پر محسوس ہو رہی تھی۔ عام حالات میں، میں نے اپنا ہاتھ اس چاقو تک پہنچانا ہوتا تو اس کے لیے دو تین سیکنڈ درکار ہوتے لیکن اب چاقو اور ہاتھ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ محسوس ہوتا تھا۔ میں نے مدِ مقابل کی ایک کہنی پر سے اپنی بیکار سی گرفت ختم کی اور ہاتھ کو جیب کی طرف بڑھایا۔ ڈوبتے ذہن اور ختم ہوتے حواس کے دوران یہ میری آخری کوشش تھی۔ وہ میری زندگی کی ناقابلِ فراموش گھڑیاں تھیں، ایک جان توڑ کوشش کے ساتھ میں نے اپنی جیب تک ہاتھ پہنچایا۔ چاقو جیب سے باہر آیا۔ میں نے رہی سہی قوت جمع کر کے ایک ہاتھ سے اس کا پھل کھولا پھر زمین پر ٹکا کر پھل سیدھا کیا۔ اس کے بعد کا عمل جیسے بے ہوشی میں ہی مکمل ہوا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے کب چاقو کے سرد دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ کب مدِ مقابل پر وار کیا۔ اس اندھے وار کے نتیجے میں میری گردن پر قاتل ہاتھوں کی گرفت ذرا نرم محسوس ہوئی۔ میرے پھیپھڑوں سے بچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار میرے سینے میں گھسی۔ اس ہوا نے مردہ ہوتے جسم میں پھر سے زندگی کی لہر دوڑائی۔ مجھے اپنے ہاتھوں، پیروں، میں توانائی محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ یہ توانائی پھر سے ناتوانی میں بدلتی میں نے پوری قوت سے سر کی ٹکر مدِ مقابل کے ہیبت ناک چہرے پر ماری۔ غالباً اسے مجھ سے اس حرکت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ چکرا سا گیا۔ یہ مہلت میرے لیے کافی تھی۔ میں نے ایک اندھا دھند جھٹکے سے کروٹ بدلی اور اسے اپنے نیچے کر لیا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے کی ایک جانب کو روشن کر گئی۔ بالوں بھرے چہرے کا منظر دل ہولا دینے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس ہیبت ناک شخص پر اپنی گرفت مضبوط کرتا اس کے منہ سے ایک چنگھاڑ نکلی اور اس نے مجھے تنکے کی طرح ہوا میں اچھال دیا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ اٹھے۔ وہ اپنے چاروں بازو لہراتا ہوا ایک آکٹوپس کی طرح میری جانب بڑھا۔ اس کی جھپٹ میں جست کا سا انداز تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی جگہ

چھوڑی اور اس کی پشت پر لات رسید کی۔ وہ لڑکھڑایا۔ اسے ٹھوکر لگی اور وہ گھوم کر چاروں شانے چت گرا۔ اس کے جسم کا پھیلاؤ اس کی قامت سے کہیں زیادہ تھا۔ مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ میں اسے یوں گرا سکوں گا۔ اپنے وار کی کامیابی پر خود مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے اس کے اوپر چڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا قرب مجھے اب بھی بے حد خوف زدہ کر رہا تھا۔ اس کی پُر اسرار ہیئت، اس کی بے پناہ طاقت، اس کا وحشیانہ انداز...... یہ سب کچھ جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا۔

میں نے شوکت کے ریوالور کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں مجھے ریوالور کا دستہ نظر آیا۔ یہ ریوالور مردہ رازی جان کے قریب پڑا تھا۔ میں نے چند لمحے کے لیے اپنے مدِ مقابل کو نظر انداز کرتے ہوئے ریوالور کی طرف نگاہ دوڑائی۔ حتی الامکان تیزی سے ریوالور کو ہاتھ میں لیتے ہوئے میں مڑا لیکن مدِ مقابل اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کم و بیش پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔

وہ بے حد طاقت ور ہونے کے باوجود کسی چھلاوے کی طرح تیز رفتار تھا۔ میرے ریوالور سیدھا کرتے کرتے اس نے دو لمبی چھلانگیں لگائیں اور گہری تاریکی میں اوجھل ہوگیا۔ میری انگلی نے ٹریگر پر حرکت کی۔ ریوالور نے یکے بعد دیگرے دھماکوں سے کئی شعلے اگلے لیکن تمام فائر بیکار گئے۔ میں نے بھاگ کر شکستہ دیوار کی دوسری جانب دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ وہ خونی درندہ ایک بار پھر کھنڈر کی تیرگی میں گم ہو چکا تھا۔ بلکہ میرا اندازہ تھا کہ وہ کھنڈر سے ہی بالکل نکل گیا ہے۔ کھنڈر سے آگے گنے کی اونچی فصل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ فصل سے آگے جنتر کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ چھپنے کے لیے وہ علاقہ بہت مناسب تھا۔

فائرنگ سے ہونے والے دھماکے سناٹے کا سینہ چیر کر دور تک گئے تھے۔ آوارہ کتوں کا شور سنائی دینے لگا تھا، اس کے ساتھ ساتھ ہمارے گھوڑے بھی ہنہنانا شروع ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ کافی فاصلے پر بندھے تھے۔ میں چند لمحے ساکت و جامد اپنی جگہ کھڑا رہا پھر شوکت کا جائزہ لیا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ وہ زندہ تھا، تاہم شدید زخمی نظر آتا تھا۔ اس کی ناک سے خون کی لکیر بہہ کر گردن تک آ گئی تھی ''شوکت...... شوکت'' میں نے

اضطراری حالت میں اسے جھنجوڑا۔ اس کے سوا اب کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں اسے کندھے پر اٹھالوں اور گاؤں کی طرف روانہ ہو جاؤں۔

☆=====☆=====☆

شوکت کو تحصیل اسپتال تک پہنچانے اور پھر واپس باغ پور آتے آتے صبح ہوگئی۔ شوکت کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی اور ایک کندھا بھی اتر گیا تھا۔ جسم پر اور بھی چھوٹی بڑی ضربات تھیں۔ یہ سب کچھ عجیب الخلقت شخص کے فقط ایک دھکے سے ہوا تھا۔ اس سے اس شخص کی بے پناہ جسمانی طاقت اور حیوانی فطرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا ہولناک سراپا ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور وہ سارا واقعہ مجھے ایک ڈراؤنا خواب محسوس ہو رہا تھا۔

باغ پور میں واپس آتے ہی اے ایس آئی نذیر اور میں سیدھے چوہدری ارباب کی حویلی میں پہنچے۔ چوہدری کے کارندے نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور خود چوہدری کو بلانے کے لیے چلا گیا۔ کارندہ گم صم سا دکھائی دے رہا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد چوہدری کا بیٹا عالمگیر آنکھیں ملتا ہوا بیٹھک میں پہنچ گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ جاگنے کی ایکٹنگ کر رہا ہے ورنہ وہ رات بھر سویا ہی نہیں ہے یا سویا ہے تو بہت تھوڑی دیر کے لیے۔

''کیا بات ہے چھوٹے چوہدری صاحب! آپ کو تو ذرا جلدی اٹھنے کی عادت ہے؟'' اے ایس آئی نذیر نے پوچھا۔

''بس یونہی رات کو سوتے سوتے ذرا دیر ہوگئی۔ دعوت تھی ناں۔'' عالمگیر نے عام سے لہجے میں کہا پھر میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''خیر ہے اسلم صاحب......! آپ سویرے سویرے کیسے آ گئے؟''

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''چھوٹے چوہدری! کل رات تمہارے ساتھ شکاری رازی جان بھی تھا؟''

عالمگیر کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے رازی جان کو؟'' عالمگیر نے اپنے لہجے میں حیرت جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق اے ایس آئی نذیر نے سخت لہجے میں کہا۔ ''رازی

جان کو رات کسی نے قتل کر دیا ہے!''

عالمگیر نے ایک بار پھر حیران ہو جانے کی زبردست اداکاری کی اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''یہ......کیسی بات کر رہے ہو تم؟''

ہم دونوں خاموش رہے۔ ہم دونوں کو خاموش دیکھ کر عالمگیر نے پوچھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کل رات...... ہمارے ساتھ تھا۔ بالکل ٹھیک ٹھاک......''

نذیر نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے چوہدری صاحب! کل رات آپ کہاں تھے؟''

عالمگیر کے ماتھے پر ناگواری کی شکن ابھری۔ وہ ذرا گردن اکڑا کر بولا۔ ''میں نے کہاں ہونا تھا۔ دعوت کے بعد ہم سونے کے لیے چلے گئے تھے۔''

''اور رازی جان؟'' نذیر نے پوچھا۔

''رازی جان بھی واپس چلا گیا تھا۔ ابا جی نے اسے کہا بھی تھا کہ اکیلے نہ جاؤ...... یا پھر صبح چلے جانا لیکن وہ نہیں مانا۔ اس کے پاس رائفل تھی۔ ویسے بھی وہ دلیر بندہ ہے...... لل......لیکن......کیا وہ واقعی......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

میرا جی چاہا اس مکری فریبی کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دوں۔ کل رات میں نے اور شوکت نے اپنے کانوں سے کھنڈر میں عالمگیر اور رازی جان کی آوازیں سنی تھیں۔ ایسی صورتِ حال کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی پولیس، مجرموں سے مار پیٹ کرنے میں حق بجانب بھی ہوتی ہے۔ مجرم کے ظاہری رویے سے کچھ بھی اندازہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر میں کل رات کے واقعے کا چشم دید گواہ نہ ہوتا تو یہاں اس حویلی میں اس آنکھیں ملتے چوہدری کو دیکھ کر کبھی نہ کہہ سکتا کہ وہ جرم میں پوری طرح شریک ہے۔

میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبی دار مفلر نکالا اور عالمگیر کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے چوہدری! میرا خیال ہے کہ یہ تمہارا ہی مفلر ہے۔ یہ ہمیں رازی کی لاش کے پاس سے ملا ہے۔''

میں نے دیکھا کہ عالمگیر کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ لہرا گیا۔ وہ ہکلا کر بولا۔

''یہ......یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ......میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

"لیکن ہماری سمجھ میں بہت کچھ آ رہا ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "یہ تمہارا مفلر ہے اور یہ اس وقت تمہارے کندھے سے گر گیا تھا، جب تم نے رازی جان کو قتل کیا۔" میرے آخری الفاظ عالمگیر پر بجلی بن کر گرے اس کا تاریک چہرہ کچھ اور تاریک ہو گیا۔ وہ واضح طور پر بری طرح نروس ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

وہ بے حد غیر متاثر کن لہجے میں بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم لوگ......مم......میں نے......کسی کو قتل نہیں کیا......مم......میں تو رات بھر حویلی میں رہا ہوں۔ تم بغیر سوچے سمجھے بول رہے ہو۔ تمہیں اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

نذیر نے کہا۔ "اگر تم کل رات حویلی سے باہر نہیں گئے اور دعوت کے بعد سو گئے......تو پھر مفلر ہوا میں اڑ کر اسکول کے کھنڈر میں پہنچا؟"

"......یہ میرا مفلر نہیں ہے۔" عالمگیر نے حسبِ توقع جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "تمہارا نہیں ہے تو پھر تم اپنا مفلر لا کر دکھا دو جو تم نے رات کو گلے میں ڈال رکھا تھا۔"

عالمگیر تھوک نگل کر رہ گیا۔ وہ ابھی میرے اس اہم ترین سوال کا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور چوہدری ارباب بڑے طنطنے سے اندر داخل ہوا۔ وہ حسبِ معمول اونچے شملے کی پگڑی سر پر رکھے ہوئے تھا۔ بڑے چوہدری کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر گھبرایا ہوا چھوٹا چوہدری قدرے پُرسکون نظر آنے لگا۔ چوہدری ارباب خاصے مضبوط اعصاب کا شخص لگتا تھا۔ اس نے بڑی تسلی سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور سلام دعا کے بعد سامنے رکھی بان کی نشست پر بیٹھ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ شاید وہ دروازے کے عقب سے ہماری گفتگو سنتا رہا ہے اور بیٹے کے حواس باختہ ہو جانے کا منظر بھی اس نے ملاحظہ کیا ہے۔

"کیا مسئلہ ہو گیا ہے نذیر؟" اس نے اے ایس آئی نذیر کو یوں مخاطب کیا جیسے چھوٹے بچوں کو کیا جاتا ہے۔

میرے اشارے پر اے ایس آئی نذیر نے وہ ساری باتیں کہہ دیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے عالمگیر کے سامنے کہی تھیں اور یہ بھی بتا دیا کہ مفلر اس نے خود موقع واردات سے اٹھایا ہے۔

نذیر کی ساری بات تسلی سے سننے کے بعد چوہدری ارباب نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ "لیکن مجھے یہ سب کچھ بتانے کے لیے انسپکٹر شوکت خود کیوں نہیں آیا۔ تم دونوں کو کیوں بھیج دیا ہے؟"

"انسپکٹر صاحب گاؤں میں نہیں ہیں۔ وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔" نذیر نے گول مول جواب دیا۔

چوہدری کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے نذیر کی بات پر یقین نہیں آیا، بہرحال اس نے اس بارے میں مزید بحث مناسب نہیں سمجھی۔ اس کی نگاہیں نذیر کے ہاتھ میں پکڑے ڈبی دار مفلر پر جمی تھیں۔ وہ مدبرانہ لہجے میں بولا۔ "تو تم دونوں اس مفلر کی وجہ سے عالمگیر کو مجرم ٹھہرا رہے ہو۔" لہجے میں طنز اور شکوہ نمایاں تھا۔

میں اور نذیر خاموش رہے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ رازی کی موت ہو گئی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ مفلر عالمگیر کا ہے لیکن رازی کی موت اور اس مفلر میں کوئی سانجھ (تعلق یا واسطہ) نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب! یہ ہم بھی جانتے ہیں کہ اس قتل کے سلسلے میں ابھی کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔"

"تو پھر تم لوگوں نے اتنے یقین سے کیوں کہہ دیا کہ قاتل میرا بیٹا ہے۔"

"صرف اس لیے کہ آپ ہمیں سچ بتائیں، کیونکہ آپ سچ جانتے ہیں۔"

چوہدری کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھریں۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم تھانے دار شوکت کے دوست ہو لیکن خود تو پولیس میں نہیں ہو۔ تمہارا یہاں آنا کس طرح بنتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں نے کب کہا ہے کہ میں پولیس والا ہوں اور آپ سے تفتیش کرنے آیا ہوں۔ اس معاملے کی تفتیش تو پولیس ہی کرے گی۔ میرا کام تو اخباری نمائندے کا ہے۔ ہم لوگ اپنے طور پر سچ تک پہنچنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اگر آپ مناسب نہیں سمجھتے تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔"

چوہدری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نذیر نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "چوہدری جی!

اسلم صاحب اپنے بھروسے کے آدمی ہیں۔ یہ کر سکے تو آپ کا کوئی فائدہ ہی کریں گے
نقصان نہیں کریں گے۔“

چوہدری بہت گہری نظروں سے کبھی میری طرف کبھی اے ایس آئی نذیر کی طرف
دیکھتا رہا۔ تب اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ یہ اس بات
طرف اشارہ تھا کہ اس نے یہاں میری موجودگی کو برداشت کرلیا ہے۔ وہ جانتا تھا
رازی جان کا قتل ایک سنگین معاملہ ہے اور وہ اس موقع پر مقامی ایس ایچ او سے کو
اختلاف پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے عالمگیر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا
”عالم...... دروازہ بند کردو۔“

قدرے گھبرایا ہوا عالم یعنی عالمگیر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے دروازہ بھیڑ دیا
چوہدری ارباب نے حقے کی طرف اشارہ کیا۔ عالمگیر نے حقہ باپ کے سامنے رکھ دیا
نشست پر بیٹھ گیا۔ حقہ تازہ نہیں تھا لیکن ابھی جل رہا تھا۔ چوہدری ارباب اضطراب
عالم میں چھوٹے چھوٹے کش لینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں
تھیں۔ آخر وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”نذیر محمد......! میں ابھی خود اپنا بندہ تھا
بھیجنے والا تھا۔ میری مرضی تھی کہ شوکت سے اس بارے میں کھل کر بات کرلوں۔
اچھا ہے کہ تم خود ہی آگئے ہو۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ان لوگوں سے بے وقوفی ہو
ہے۔ میں نے ان سے کہا بھی تھا کہ یہ کام خطرناک ہے......“

”آپ کن لوگوں کی بات کررہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تحصیل دار صاحب کے انگریز دوستوں کی بات کررہا ہوں۔ یہ عالم بھی ا
کے ساتھ پاگل ہورہا تھا۔ میں نے ان سب سے کہا بھی تھا کہ خواہ مخواہ اپنی جان خطر
میں نہ ڈالیں پر یہاں مانتا کون ہے؟ گرم خون ہے۔ سیانوں کی بات کو واہیات مذاق سمجھ
ہیں۔“

نذیر نے کہا۔ ”چوہدری صاحب......! آپ کچھ کھل کر بتائیں تو ہماری سمجھ میں
آئے۔“

چوہدری نے حقہ گڑگڑایا اور بولا۔ ”پچھلے کچھ دنوں سے جو کچھ باغ پور میں ہو

ہے اس کا تمہیں بھی پتا ہے۔ نہ پولیس کچھ کرسکی ہے نہ کسی دوجے کے ہاتھ کوئی کھوج لگا
ہے۔ کھوجی بھی ابھی تک بس ٹکریں ہی مار رہے ہیں۔ وہ کیا نام ہے اس کا...... جاکب
(جیکب)......اس کے دماغ میں یہ بات گھسی ہوئی تھی کہ قتل کرنے والے کا پتا چلانا ہے،
چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ میں نے سمجھایا بھی کہ بھئی...... یہ پولیس کا کام ہے اور وہ اپنا کام
کررہی ہے لیکن جاکب اور اس کا چھوٹا بھائی مسلسل اپنی ٹانگ اڑاتے رہے۔ کل رات
میرے منع کرنے پر بھی جاکب باز نہیں آیا اور ان سب کو لے کر اسکول کے کھنڈر کی طرف
نکل گیا۔ دراصل میرے مزارع انور مسیح نے یہ اطلاع دی تھی کہ اس نے شام کے بعد
کھنڈر میں کوئی شے ہلتی ہوئی دیکھی ہے۔ لگتا تھا کہ کوئی بندہ وہاں چھپا ہوا ہے۔ یہ جاکب
فوراً تیار ہوگیا۔ کہنے لگا کہ میں کھنڈر میں جاکر دیکھوں گا۔ اس کے دونوں ساتھی اور وہ میم
صاحب بھی تیار ہوگئی۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ تینوں باز نہیں آئیں گے تو میں نے
شکاری رازی جان اور پتر عالم کو بھی ساتھ بھیج دیا۔ جب تم لوگ دعوت کھا کر گئے اس کے
فوراً بعد یہ لوگ کھنڈر کی طرف چلے گئے تھے۔ میں بڑی دیر تک پریشان پھرتا رہا۔ مجھے ڈر
تھا کہ کہیں تحصیل دار صاحب کے مہمانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ان کو تو نقصان نہ
پہنچا لیکن شکاری رازی جان کی جان چلی گئی۔“

میں نے کہا۔ ”چوہدری صاحب، اگر آپ یہ باتیں کل رات انسپکٹر شوکت کو بتاتے
تو شاید رازی کی جان بچ جاتی لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ بہرحال اب اس بات کو
دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“

چوہدری نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی
غلطی تسلیم کررہا ہے۔ (یا ظاہر کررہا ہے کہ وہ غلطی تسلیم کررہا ہے) اس نے کش لیتے ہوئے
کہا۔ ”تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے ایڈیٹر صاحب، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ بے وقوف
جاکب (جیکب) اس سارے کام کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ
قاتل کو پکڑ کر تھانے میں پیش کرے گا اور یوں ایک بڑا کارنامہ انجام دے گا۔ بس ان
انگریزوں کی سوچ وکھرے ٹائپ کی ہوتی ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی تمغا اپنی چھاتی پر
لگانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ چاہے اس تمغے کے چکر میں چھاتی ہی باقی نہ رہے۔ الٹے

سے الٹے کام کو بھی شغل کے طور پر لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔"اگر یہ شغل بھی ہے تو...... پھر اس شغل کی وجہ سے جو جان گئی ہے اس کی ذمے دار کس پر ہو گی؟"

"ذمے داری اس پر ہو گی جس نے جان لی ہے، اور اس کے پہلے بھی دو جانیں لی ہیں۔ وہ جو بھی ہے بڑا بے رحم خونی ہے۔ وہ جتنی جلدی پکڑا جائے اتنا ہی سب کے لیے اچھا ہے۔"

"جیکب اور عالمگیر نے کھنڈر سے آ کر آپ کو کیا بتایا ہے؟"

"انہوں نے بے وقوفی کے اوپر بے وقوفی کی ہے۔"

چوہدری نے غصیلی نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"رازی جان کی لاش دیکھ کر یہ ڈر گئے۔ تھوڑی دیر تک خونی کو کھنڈر میں ڈھونڈنے کے بعد واپس آ گئے۔ حویلی واپس آ کر بھی انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اگر یہ بتا دیتے تو اچھا ہوتا۔ ہم اس بدبخت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے، بس ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی عالم نے مجھے اس بارے میں بتایا ہے۔"

میں نے عالمگیر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔"چھوٹے چوہدری صاحب! تم تو موقع پر موجود تھے۔ تم نے سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کیا کہ ہوا تھا؟"

عالمگیر نے پہلے باپ کی طرف دیکھا پھر کھنکارتے ہوئے بولا۔"ہم آگے تھے...... رازی جان پندرہ بیس قدم پیچھے تھا۔ اچانک خرخرانے کی آواز آئی۔ ہم بھاگے ہوئے واپس آئے۔ رازی گھاس پر پڑا تھا اور اس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔ اس وقت جیکب صاحب نے دیوار کے پیچھے ایک پرچھانواں دیکھا۔ انہوں نے نشانہ لے کر فائر مارا۔ پرچھانواں غائب ہو گیا۔ ایسے لگا کہ وہ کھنڈر سے نکل کر کھیتوں کی طرف گیا ہے۔ ہم گاڑی لے کر اس کے پیچھے بھاگے۔ دور دور تک دیکھا پر کوئی کھوج نہیں ملا۔ ہمیں شک گزرا کہ شاید "خونی" چکر کاٹ کر پھر کھنڈر کی طرف آ گیا ہے۔ ہم واپس آئے اور کافی دیر تک کھنڈر کے اندر باہر اسے ڈھونڈتے رہے، اس کا کچھ پتا

نہیں چلا۔ بہرحال ایک بات تو کھل کر سامنے آ گئی۔ وہ جو کوئی بھی ہے جیتا جاگتا بندہ ہے۔ کوئی جن بھوت یا ہوائی شے نہیں ہے۔ ابا جی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ وہ جتنی جلدی پکڑا جائے ہم سب کے لیے بہتر ہے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے قتل کر رہا ہے۔ جو بھی اس کی زد میں آتا ہے وہ اسے مار دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پاگل خانے سے بھاگا ہوا کوئی مریض ہو یا پھر کوئی جنونی جس کو قتل کرنے کا چسکا لگ گیا ہو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس کی شکل صورت دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔" میں نے پوچھا۔

عالمگیر نے نفی میں سر ہلایا۔"نہیں اسلم صاحب، بس اتنا پتا چل رہا تھا کہ وہ کوئی لمبے قد کا بندہ نہیں ہے۔ جسم چوڑا چکلا ہے اور وہ کافی پھرتیلا بھی لگتا ہے......"

میری نگاہوں میں قاتل کا سراپا گھومنے لگا۔ جسم میں جھرجھری سی اٹھی۔ جو کچھ میں دیکھ چکا تھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ میں نے ابھی تک اس کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔ اے ایس آئی نذیر بھی میرے اس ہولناک تجربے سے بے خبر تھا۔

اے ایس آئی نذیر نے عالمگیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"چھوٹے چوہدری صاحب! برا نہ مانیے گا لیکن...... آپ کو رازی جان کی لاش اس طرح کھنڈر میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ لاش کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔"

عالمگیر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔"لل...... لیکن جیک صاحب نہیں مانے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"مصیبت میں تو اب بھی آپ پھنس گئے ہیں۔ ایک انسان کی جان گئی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

چوہدری ارباب نے دوستانہ لہجے میں کہا۔"دیکھو اسلم صاحب......! میں نے تم دونوں کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا ہے۔ انسپکٹر شوکت آتا ہے تو اسے بھی ساری بات کھول کر بتا دوں گا۔ اب اس معاملے کو کس طرح سنبھالنا ہے، یہ تم لوگ سوچو۔ جہاں تک رازی جان کی بات ہے میں نے اس سے بھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ یہ گورے صاحب رات کے وقت کھنڈر کی طرف جا کر خطرناک کام کر رہے

ہیں۔ وہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ جانا چاہتا ہے تو چلا جائے ورنہ کوئی اور چلا جائے گا۔
رازی جان اپنی خوشی سے گوروں کے ساتھ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر گوروں کو اپنے کام میں کامیابی ہوئی تو وہ خوش ہو کر اسے بھاری انعام واکرام دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب، ہم آپ کی بات کو جھٹلانے کا سوچ بھی نہیں سکتے لیکن اس معاملے میں ابھی کئی الجھنیں موجود ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے یہ انگریز مہمان آپ سے بھی کچھ چھپا رہے ہوں۔"

"نہیں، نہیں ایڈیٹر صاحب......" چوہدری ارباب نے جلدی سے کہا۔ "میں ان مہمانوں کے بارے میں اپنی طرف سے ہر طرح کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ تمہیں ان کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی چوہدری ارباب اٹھ کر اندر گیا اور تھوڑی دیر میں جیکب اور اسمتھ کو لے کر آ گیا۔ ان کے پیچھے ہارڈی بھی تھا۔ ہارڈی اپنے نام ہی کی طرح سخت گیر اور بے مروت نظر آتا تھا۔ کل رات سلویا اور اس کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ ایک بار پھر میرے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ سلویا ایک نرم و نازک اور مہذب لڑکی نظر آتی تھی۔ ہارڈی صورت سے ہی گھاگ اور کرخت تھا۔ ان دونوں کا جوڑ کسی طور سے مناسب نہیں تھا لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ ہارڈی زبردستی یہ جوڑا بنانے پر تلا ہوا ہے۔ ہارڈی کی ٹھوڑی پر گہرا نیل نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح جیکب کی پیشانی پر بھی چوٹ کا نشان تھا اور سوجن دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً ان چوٹوں کا تعلق کل رات کی بھاگ دوڑ سے ہی رہا ہوگا۔ تینوں انگریز دوستوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے اور وہ قدرے دبے دبے دکھائی دیتے تھے۔

چوہدری ارباب علی نے ایک بار پھر میرا اور نذیر کا تعارف کرایا اور بولا۔ "یہ اپنے انسپکٹر شوکت کے سجن ہیں۔ اس لیے اپنے بھی سجن ہیں۔ ان سے کوئی پردہ شردہ نہیں۔ کل رات جو کچھ بھی ہوا ہے وہ آپ کھل کر ان کو بتا دو۔ یہ کوئی چنگا مشورہ ہی دیں گے۔"

چوہدری نے گلابی اردو بولی تھی۔ بہرحال، بات کا مفہوم جیکب کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ میں انگریزی سمجھ سکتا ہوں۔ اس نے کل رات پیش آنے والے

سارے واقعے کی تفصیل انگریزی میں بتا دی۔ اس کا بیان اور عالمگیر کا بیان تقریباً ایک جیسا تھا۔ میں اور نذیر خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے درمیان میں ایک دو سوال بھی کیے۔ جیکب نے کم و بیش تمام واقعات درست بتائے تھے۔ جیکب اور عالمگیر کو معلوم نہیں تھا کہ میں کل رات ان واقعات کا چشم دید گواہ رہا ہوں۔ جیکب نے صرف ایک چیز کا اضافہ کیا۔ اس نے کہا۔ "میں قاتل کا چہرہ تو نہیں دیکھ سکا لیکن میں نے اس کا ہیولا کافی قریب سے دیکھا۔ وہ غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا ہے۔ اس کی لمبائی دیکھتے ہوئے اس کی چوڑائی کا یقین کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم نے ایک چوکور جاندار کو دیکھا ہے......"

محسوس ہوا کہ کھنڈر میں پائے جانے والے شخص کا حلیہ بیان کرتے ہوئے جیکب مبالغے سے کام لے رہا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایسا خوف کی وجہ سے ہو رہا ہو۔ مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی چشم دید گواہ قاتل کے مختلف حلیے بیان کرتے رہے ہیں۔ مقتول بشیرے کی بیوی زبیدہ نے بتایا تھا کہ قاتل کے چار بازو ہیں اور یوں لگتا ہے کہ اس کی ٹانگیں بھی دو سے زیادہ ہیں۔ شوکت کے مخبر چاند نے بھی حملہ آور کے حلیے کو مزید پُراسرار اور ہولناک بنا کر پیش کیا تھا۔ چاند کے مطابق حملہ آور کی حرکات و سکنات انسان سے زیادہ درندے کے قریب تھیں۔ اسے اس کے سر پر سینگ نما چیزیں بھی نظر آئی تھیں۔ کچھ لوگ حملہ آور کا سر عام آدمی کے سر سے دگنا بتاتے تھے اور کچھ اسے مٹکے کے برابر قرار دیتے تھے۔ افواہیں پھیلانے والوں نے اس کے سر پر باقاعدہ دو سینگ بھی اُگا دیے تھے اور اس کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ انگارے فٹ کر دیے تھے۔ اس عجیب الخلقت شخص کے بارے میں اب تک جو آخری اطلاع بہم پہنچی تھی وہ مزارعے طفیل محمد کے حوالے سے تھی۔ طفیل نے بتایا تھا کہ اس نے جو ہیولا دیکھا اس کی گردن نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ کندھوں کے اوپر ہی بہت بڑا سر رکھا ہوا ہے۔ بعد میں طفیل اپنے بیان سے انکاری ہو گیا تھا اور اس نے تسلیم کیا تھا کہ وہ چاند کے پیچھے کسی ہیولے کو نہیں دیکھ سکا۔ بہرحال اب یہ سارے بیانات میرے لیے بے معنی تھے۔ میں کل رات اس عجیب الخلقت شخص کو اپنے روبرو دیکھ چکا تھا اور اس سے دو دو ہاتھ بھی کر چکا تھا۔ وہ میرے لیے کوئی غیر مرئی شے نہیں رہی تھی۔ گوشت پوست کا زندہ انسان بن گیا تھا۔ اس حوالے سے میں نے اب تک جو سوچ بچار

کی تھی اس کا نتیجہ کچھ یوں تھا۔ باغ پور پر جو آفت نازل ہوئی تھی، اس کا تعلق کسی غیر مرئی شے سے نہیں تھا، نہ ہی کسی خوفناک درندے سے تھا...... یہ ایک انسان تھا۔ آج سے [illegible] پندرہ یا بیس سال قبل کسی عورت نے ایک عجیب الخلقت بچے کو جنم دیا تھا۔ ایسے بچے یا تو پیدائش کے چند گھنٹے بعد جاں بحق ہو جاتے ہیں یا انہیں تلف کر دیا جاتا ہے۔ گھروں میں دائیاں یہ کام کرتی ہیں اور اسپتالوں میں بعض اوقات یہی کام طبی عملہ کر گزرتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا۔ یہ عجیب الوضع بچے زندہ رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی بچہ تھا، اس نے جنم لیا تھا اور اپنے تمام تر انوکھے پن کے ساتھ زندہ رہا تھا۔ شاید والدین کی محبت اس کی زندگی کا جواز بن گئی تھی۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اور جیسے بھی ہوا تھا بہرحال ایک حقیقت اب واضح تھی۔ ماضی کا وہ کریہہ المنظر بچہ اب ایک نہایت طاقت ور اور خطرناک شخص کا روپ دھار چکا تھا۔ یہاں باغ پور میں اس کے ہاتھوں کئی افراد اپنی جان گنوا چکے تھے۔ کئی زخمی بھی ہوئے تھے۔ میرا یار شوکت بھی ان میں شامل تھا۔

جیکب کی آواز نے مجھے چونکایا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''کل رات سے میرا دماغ گھوم رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے جاگتی آنکھوں سے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ یہ اسمتھ [illegible] ابھی واپس لوٹ جانے کو کہہ رہا ہے۔ اس کا خیال وہی ہے جو یہاں گاؤں کے دوسرے لوگوں کا ہے۔ یہ کیتھولک ہے۔ آسیب اور ارواح وغیرہ پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کھنڈر میں آسیب ہے۔ ہم نے کھنڈر میں گھس کر صورتِ حال مزید ابتر کر دی ہے۔ اب مزید خون خرابا ہو سکتا ہے۔''

''اور تمہارا اپنا کیا خیال ہے جیکب؟'' میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' جیکب کے ماتھے پر شکن ابھری۔

پتا نہیں کیوں مجھے اس سفید چمڑی والے پر غصہ آنے لگا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر جیکب، تم تحصیل دار صاحب کے مہمان ہو۔ اس لیے میرے لیے بھی قابلِ عزت ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم یہاں اپنی من مانیاں کرو۔ شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ مقامی لوگ عقل سے بالکل فارغ ہیں۔''

''تت...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' جیکب نے کہا۔ رات والے واقعے کے بعد وہ کافی دبا دبا نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ رازی کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں مسٹر جیکب...... لیکن کل رات دعوت کے موقع پر بھی تم مجھے اور انسپکٹر کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ قتل کی وارداتوں کا یہ سارا معاملہ پُراسرار اور آسیبی ہے۔ اس معاملے کی چھان پھٹک کرنے سے جان کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ مجھے اس وقت یہی محسوس ہوا تھا کہ ہم تمہاری نظر میں نادان بچوں کی طرح ہیں اور تم ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ گستاخی معاف......! ٹھیک ہے کہ آپ لوگ زیادہ تعلیم یافتہ اور ماڈرن ہیں لیکن یہاں بھی سارے لوگ نکمے اور جاہل نہیں ہیں۔ حقیقت اور وہم میں تمیز کرنے والے ہمارے اندر بھی پائے جاتے ہیں اور ان میں سے کچھ کو آپ لوگوں کی طرح بال کی کھال اتارنا بھی آتی ہے۔''

''تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو مسٹر اسلم۔ سچی بات یہ ہے کہ فی الحال ہم میں سے کوئی بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ حملہ آور کون ہے۔ ابھی تک اسے کسی نے دیکھا ہی نہیں اور جنہوں نے دیکھا ہے وہ مر چکے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے دیکھا ہے۔''

''کک...... کیا مطلب!'' جیکب اور ہارڈی نے ایک ساتھ کہا۔ دونوں کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

''ہاں۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ کل رات کھنڈر میں مجھ سے اور شوکت سے اس کی ملاقات ہوئی ہے۔ اسی ملاقات کے نتیجے میں شوکت یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ زخمی ہو کر تحصیل اسپتال میں پڑا ہے۔'' میں یہ باتیں اردو میں کر رہا تھا تاکہ انگریزوں کے ساتھ ساتھ چوہدری ارباب اور عالمگیر بھی سمجھ سکیں۔

چوہدری ارباب کے چہرے پر شدید حیرت نظر آنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کیا ہوا ہے شوکت کے ساتھ...... تم مجھے کھل کر بتاتے کیوں نہیں ہو!''

میں نے کل رات پیش آنے والے واقعے میں سے چیدہ چیدہ باتیں چوہدری ارباب کو بتائیں چوہدری یہ جان کر ششدر رہ گیا کہ میں نے کھنڈر میں پائے جانے والی

اس مخلوق سے دو دو ہاتھ کیے ہیں اور اسے بالکل قریب سے دیکھا ہے۔ تینوں انگریز بھی اس حیرت میں برابر کے شریک تھے۔ وہ مجھ سے بار بار حملہ آور کا حلیہ پوچھ رہے تھے اور اس بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ میں جو کچھ بتا رہا تھا وہ محمد نذیر کے لیے بھی انکشاف انگیز تھا۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ رات اسکول کے کھنڈر میں کیا ہوا ہے اور انسپکٹر شوکت کہاں اور کس حال میں ہے۔

چند روز پہلے جب بشیرے کی بیوہ زبیدہ نے حملہ آور کا حلیہ بیان کیا تھا تو بہت کم لوگوں نے اس کی باتوں پر یقین کیا تھا لیکن پھر یکے بعد دیگرے کئی افراد کی زبان سے اس سے ملتی جلتی باتیں ہی نکلی تھیں اور اب میں خود بھی حملہ آور کے حلیے کا چشم دید گواہ بن گیا تھا۔ میری بات ختم ہوئی تو بیٹھک میں گمبھیر سناٹا طاری تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہا ہے۔ اس وقت اتفاقاً میری نگاہ اندر کی بالکونی کی طرف چلی گئی۔ ایک پردے کی اوٹ میں مجھے سلویا کھڑی نظر آئی۔ اس کے شہد رنگ بال شانوں پر بکھرے تھے۔ ایک ریشمی گاؤن اس کے کندھوں پر تھا۔ گاؤن کے نیچے اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ اپنے جسم پر میری نگاہوں کی تپش محسوس کر کے اس نے گاؤن کو درست کیا اور ہولے سے مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی ادا میں لگاوٹ کے عنصر کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ جیکب اور ہارڈی وغیرہ ایسے رخ پر بیٹھے تھے کہ وہ سلویا اور میری نگاہوں کے دلچسپ ملاپ کو نہیں دیکھ سکے۔

جیکب نے دبے دبے انداز میں کہا۔ ''مسٹر اسلم! آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کھنڈر سے رازی جان کی لاش آپ دونوں نے ہی دریافت کی ہے۔''

میں نے اس بات کا جواب اثبات میں دیا۔ جیکب نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں استعجاب کے عالم میں گھمائیں۔ ''تم نے دیکھا ہی ہوگا، رازی کی گردن کس بری طرح ٹوٹی ہے۔ یہ سارا کچھ ایک دو سیکنڈ کے اندر ہوا تھا۔ کیا واقعی یہ کسی انسان کا کام ہے؟''

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''مسٹر جیکب تم اس معاملے کو جو رنگ بھی دو، مگر میرے لیے قاتل ایک انسان ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تم اسے جنونی قاتل کہہ سکتے ہو۔ وہ عجیب الخلقت ہے، لیکن انسان ہے۔ باقی جو کچھ اس کے بارے میں کہا جا رہا ہے وہ صرف

افواہوں کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کی چار ٹانگیں نہیں۔ نہ اس کی آنکھوں سے شعاعیں نکلتی ہیں، نہ گردن غائب ہے۔ یہ سب سینہ گزٹ ہے۔''

جیکب بولا۔ ''یہ تو میں بھی کہتا ہوں کہ لوگ جذباتی ہو رہے ہیں......اور جذباتی ہو کر الٹی سیدھی بھی ہانک رہے ہیں......''

''بلا سوچے سمجھے میرے خیال میں تم نے بھی جذباتی پن کا مظاہرہ کیا ہے۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔ ''تم ساتھیوں سمیت کھنڈر میں گھس گئے اور ایک مقامی کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ یہی نہیں ہوا تم اس کی لاش بھی وہیں چھوڑ آئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے تمہاری کم ہمتی کہا جائے گا یا یہ تمہاری کوئی پلاننگ تھی۔ بہرحال دونوں صورتوں میں تم ذمے دار ہو......اور قانون کی زد میں بھی آتے ہو۔''

اے ایس آئی نذیر نے ہولے سے سر ہلا کر میری بات کی تائید کی۔

کل رات دعوت میں فر فر بولنے والے ہارڈی اور اسمتھ بھی یکسر خاموش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک بڑے چکر میں پھنس گئے ہیں۔ کچھ دیر تک کمرے میں گہرا سکوت رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ سلویا کہیں آس پاس ہی موجود ہے اور ہماری باتیں سن رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری ارباب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔ ''باؤ اسلم......! جو کچھ بھی ہو گیا۔ اب اسے دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے سوچنے کی بات اس وقت یہ ہے کہ باغ پور اور آس پاس کا علاقہ اس خونی کی زد میں ہے۔ وہ بچوں، بوڑھوں، عورتوں، سب کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے، اس کے چار ہاتھ ہیں یا پانچ ہیں، یہ سب باتیں بعد میں بھی سوچی جا سکتی ہیں۔ فوری طور پر ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خونی کو زندہ یا مردہ پکڑا جائے۔''

عالمگیر اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔ اس نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''اب ہمیں اور انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خبیث بے رحمی سے لوگوں کو مار رہا ہے۔ لوگ پہلے ہی بڑا ڈرے ہوئے ہیں۔ کل رات ہونے والے قتل کی خبر جب پھیلے گی تو لوگ اور بھی ڈر جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر چھوڑنا شروع کر دیں۔ اس سے پہلے کہ یہ خوف آس پاس کے دیہات میں بھی پھیل جائے......اور افراتفری مچے......ہمیں اس

خونی کو ڈھونڈ لینا چاہیے۔''

میں نے کہا۔''افراتفری سے زیادہ ہمیں انسانی جانوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔تین ہلاکتیں ہو چکی ہیں۔چوتھی ہو گئی تو کہرام مچ جائے گا۔''

چوہدری ارباب نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو باؤ اسلم ......'' پھر وہ اے ایس آئی نذیر سے مخاطب ہو کر بولا۔''نذیر تمہاری رائے کیا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

نذیر نے وہی جواب دیا جو میں چاہتا تھا۔وہ بولا۔''چوہدری صاحب! میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں، میری بات کا برا نہ مانیے گا لیکن ایک بات بالکل صاف ہے۔جب تک آپ اس سارے معاملے کے بارے میں کھل کر نہیں بتائیں گے، میری مدد سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔''

چوہدری ارباب نے کہا۔''کھل کر بتانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم کچھ چھپا رہے ہیں؟''

''ہمارے کہنے سے کیا ہوگا لیکن حالات یہی کہہ رہے ہیں۔'' نذیر کے بجائے میں نے جواب دیا۔میرا یہ جواب پنجابی میں تھا۔میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''میں یہ سمجھتا ہوں چوہدری صاحب......! کہ آپ کے یہ گورے مہمان کچھ نہ کچھ چھپا رہے ہیں۔لگتا ہے کہ یہاں آنے سے ان کا کوئی خاص مقصد ہے۔عین ممکن ہے کہ یہ لوگ پہلے سے اس شخص کے تعاقب میں ہوں جو یہاں حملے کر رہا ہے۔یہ حملے ان دنوں میں ہی شروع ہوئے ہیں جن دنوں میں یہ لوگ یہاں آئے ہیں۔جس روز صغراں قتل ہوئی اس سے اگلے روز میں نے ان چاروں گوروں کو رات کے وقت کھیتوں میں دیکھا تھا۔تمہارا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔یہ لوگ وہاں کچھ تلاش کر رہے تھے۔میرا اندازہ ہے کہ یہ اس وقت بھی حملہ آور کے پیچھے ہی تھے اگر ایسا تھا تو پھر انہوں نے یہ بات ہم سے کیوں چھپائی۔انہوں نے بعد میں بھی کسی کو بھنک نہیں پڑنے دی کہ یہ یہاں شکار نہیں کر رہے بلکہ اس بندے کا کھوج لگا رہے ہیں جو گھات لگا کر حملے کر رہا ہے۔''

میری اس بات کا جواب جیکب نے خود دیا۔وہ سلویا ہی کی طرح گلابی اردو میں

بات کر لیتا تھا اور اپنا مافی الضمیر خاصی کامیابی سے سمجھا دیتا تھا۔وہ کافی عرصہ متحدہ ہندوستان میں رہا تھا اور یہاں کے رہن سہن سے بھی واقف تھا۔اس نے جو باتیں کیں ان میں بار بار بائی گاڈ (خدا کی قسم) کے الفاظ کے ذریعے اس نے مجھے یقین دلایا کہ جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں اس رات وہ لوگ کونج کا شکار کر رہے تھے۔کونج چونکہ رات کے وقت نکلتی ہے اس لیے وہ ٹھٹھری ہوئی رات میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔جیکب نے ایک بار پھر بائی گاڈ کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ کل شام سے پہلے انہیں اس عجیب الخلقت حملہ آور کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔کل رات سے پہلے انہوں نے حملہ آور کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا اور نہ اسے پکڑنے کا کوئی پروگرام بنایا تھا۔

جیکب کافی دیر تک اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرتا رہا۔اس کی ایک دو باتوں میں وزن بھی تھا لیکن اس کے باوجود میرے ذہن سے شک پوری طرح رفع نہیں ہوا میرا خیال ہے کہ اے ایس آئی نذیر کی بھی یہی پوزیشن تھی۔بہرحال ہم دونوں نے اس بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔شوکت کی عدم موجودگی میں ہم کسی طرح کا بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ویسے بھی اس وقت باقی ساری باتوں سے اہم یہ بات تھی کہ خونی شخص کو جلد سے جلد پکڑا جائے۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں چوہدری ارباب اور اس کے مہمانوں سے رخصت ہو کر حویلی سے نکل آئے۔حویلی سے چالیس پچاس گز دور مویشیوں کا احاطہ تھا۔ہمیں اس وسیع احاطے کے عقب سے ہو کر گزرنا تھا۔ہم گزرنے لگے تو میری نگاہ سلویا پر پڑی۔کچھ دیر پہلے وہ حشر سامان گاؤن میں نظر آئی تھی لیکن اب حسبِ معمول جرسی اور پتلون میں دکھائی دے رہی تھی۔جرسی کی آستینیں اس نے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں اور اس کی گوری چٹی سڈول بانہیں صبح کی سنہری دھوپ میں چمک رہی تھیں۔مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکی، پھر مسکرائی اور مجھے اپنے پاس بلایا۔

میں اور نذیر احاطے میں پہنچے۔سلویا کے گلے میں کیمرا لٹک رہا تھا۔غالباً وہ ایک نومولود بچھڑے کی تصویر بنا رہی تھی۔''میں نے صرف آپ کو بلایا تھا۔'' وہ میرے سینے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے مسکرائی۔شاید وہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی

تھی۔

میں نے اے ایس آئی نذیر سے کہا۔ ''نذیر! تم چلو، میں ابھی آ رہا ہوں۔''

نذیر نے سر جھکا کر سلام کیا اور آگے بڑھ گیا۔ سلویا بولی۔ ''آپ نے میری رات کی حماقت کا برا تو نہیں منایا تھا۔''

''آپ کب کی بات کر رہی ہیں؟'' میں نے بھی انگریزی میں پوچھا۔

''میں بوڑھے آدمی بابا صادق سے ڈر کر آپ سے چمٹ گئی تھی۔'' اس نے مجھے دلایا۔

''اگر وہ حماقت تھی تو بڑی خوب صورت تھی۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا اور اس کے چہرے پر حیا کی سر چھا گئی۔ بہر حال اس نے فوراً ہی خود پر قابو پایا اور سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ لوگ نشست گاہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ باتیں میں نے بھی سنی ہیں۔ مجھے یہ جان حیرانی ہوئی ہے کہ کل رات آپ نہ صرف کھنڈر میں گئے بلکہ اس خونی حملہ آور سے آپ دھواں دھار ملاقات بھی ہوئی۔ اس نے آپ پر حملہ کیا اور آپ نے اپنا دفاع کیا۔''

''اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟''

''میں نے جب پہلی بار آپ کو دیکھا تو پتا نہیں کیوں میرے دل کو لگا تھا کہ آپ بہادر ہوں گے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا ہے۔''

''خیر یہ کوئی ایسی بہادری بھی نہیں ہے کہ اس کا تذکرہ اتنے اہتمام سے کیا جائے۔'' میں نے کہا۔

وہ بڑی ذہین اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی کہنے لگی۔ ''نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ کل رات آپ کے کھنڈر میں جانے کے پیچھے کوئی خاص وجہ تھی۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''کہیں...... ایسا تو نہیں کہ آپ...... ہمارا پیچھا کرتے ہوئے کھنڈر تک پہنچے ہوں۔ جس وقت ہم لوگ گھبرا کر کھنڈر سے واپس آ رہے تھے، آپ کہیں چھپ کر ہمیں دیکھ رہے ہوں۔ بعد میں آپ خود کھنڈر میں گھس گئے ہوں۔ وہاں آپ نے شکاری کی لاش دیکھ لی

ہو...... اور پھر حملہ آور سے آپ کی مڈبھیڑ ہو گئی ہو۔''

میں نے اپنا چہرہ بہ مشکل سپاٹ رکھا اور اپنے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر سلویا کو سمجھایا کہ وہ ''خام خیالی'' کر رہی ہے۔ اندر سے میں حیران رہ گیا تھا اور سلویا کی معاملہ فہمی کا معترف ہو گیا تھا۔ اس نے کل رات کے حوالے سے ٹھیک قیافہ لگایا تھا۔

میں نے کہا۔ ''کیا آپ نے کوئی خاص بات کہنے کے لیے بلایا ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں بہت ڈری ہوئی ہوں۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ یہاں ہمارا آنا، گاؤں والوں کے لیے برا شگون ہے۔ کتنا پیارا گاؤں ہے یہ لیکن سارے کا سارا خوف اور دکھ میں ڈوبا ہوا ہے۔''

وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن اسی دوران میں بابا صادق نظر آیا۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ ہمیشہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ بھورے رنگ کی ایک صحت مند بھینس کو ہانکتا ہوا آ رہا تھا۔ سلویا کو دیکھ کر سو سالہ بابے کی باچھیں کچھ اور بھی کھل گئیں۔ کہنے لگا۔ ''میم صاحب۔ لو یہ آپ کا بھینس آ گیا۔ دودھ دینے کے لیے ایک دم تیار ہے۔ آپ اپنے ہاتھ سے دودھ دوہنے کا شوق پورا کر سکتی ہیں۔''

بابے صادق نے بھینس سلویا کے بالکل سامنے لا کھڑی کی پھر سلویا کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے بھینس کے پاس بٹھا دیا۔ بھینس کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے، رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ بابے صادق نے ایک ہاتھ میں بھینس کا تمتماتا ہوا تھن پکڑا، دوسرے ہاتھ میں سلویا کا نرم گلابی ہاتھ پکڑا، پھر اس نے تھن اور سلویا کے ہاتھ کا ملاپ کرنے کی کوشش کی۔ سلویا گھبرا رہی تھی اور اپنا ہاتھ پیچھے کو کھینچ رہی تھی۔ بابا صادق اپنے پوپلے منہ کے ساتھ ہنسا اور بولا۔ ''کچھ نہیں ہوتا میم صاحب۔ ذرا سا دباؤ، دیکھنا دودھ کی دھار نکلے گی۔''

سلویا نے تھن کو بس دو انگلیاں لگائیں، پھر ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ پاس کھڑے دو بچے سلویا کی پریشانی پر کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔ سلویا بولی۔ ''بابا...... ! تم خود دودھ نکالو...... ہام تم کو دیکھیں گا۔''

''نہیں میم صاحب، آپ بالکل بھی نہ گھبرائیں...... یہ کچھ نہیں کہے گی۔'' اس نے

تھن زبردستی سلویا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ سلویا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ذرا سا دبایا تو دودھ کی سفید سفید دھار نکلی۔ ذرا دیر میں سلویا کی ہچکچاہٹ کم ہوگئی۔ اس نے دو تھن تھامے اور بابے کی ہدایات کے مطابق دودھ دوہنے لگی۔ دودھ کی دھاریں خوش کن آواز کے ساتھ پیتل کی بالٹی میں گرنے لگیں۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔ بابا صادق تھوڑا سا اور آگے بڑھا، اس نے سلویا کو مشورہ دیا کہ وہ تازہ تازہ کچا دودھ پی کر دیکھے۔ کیونکہ اس سے زیادہ طاقت ور شے اور کوئی نہیں ہوتی۔

اس نے سلویا کا منہ کھلوایا اور اس میں دودھ کی دھار ڈالنے کی کوشش کی۔ سلویا کو پھر مشکل پیش آ رہی تھی۔ سلویا کا ڈر دور کرنے کے لیے بابے صادق نے ایک تھن منہ سے لگایا اور ہوشیار بچھڑے کی طرح غٹ غٹ دودھ پینے لگا۔ بچوں کے ساتھ ساتھ سلویا کی بھی ہنسی نکل گئی۔ سلویا نے نقل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ کچھ ڈر بھی رہی تھی۔ وہ تھن کو دباتی تھی تو دھار کبھی اس کی آنکھوں میں پڑتی تھی کبھی گردن سے جا ٹکراتی تھی۔ بچے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ آخر وہ ناکام ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ ''یہ بڑا مشکل کام ہے مسٹر آسلم!'' وہ میرے نام کا حلیہ بگاڑتے ہوئے بولی۔

''اتنا مشکل نہیں۔ بس آپ ڈری ہوئی ہیں۔'' میں نے بھی انگریزی میں کہا۔

''ہاں ڈری ہوئی تو میں واقعی بہت ہوں۔'' اس نے کہا پھر بے تکلفی سے میری کلائی تھامتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھیے! میرا دل کس طرح دھک دھک کر رہا ہے۔'' اس نے بڑے اطمینان سے میرا ہاتھ اپنے جسم پر رکھ لیا۔ اس کی باریک جرسی کا گریبان دودھ کی دھاروں سے بھیگا ہوا تھا۔

اس کے دل کی دھڑکن تو تیز تھی ہی، میرا دل بھی ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نگاہیں ملیں۔ وہ ایک جادوئی لمحہ تھا۔ وہ ایک برقی ساعت تھی۔ اس لمحے میں وہ صرف ایک عورت تھی اور میں صرف ایک مرد تھا۔ رنگ نسل، ذات، اونچ نیچ، مرتبہ...... کچھ بھی ہمارے درمیان باقی نہیں رہا تھا۔ اس لمحے نے مجھ سے بہت کچھ کہا اور شاید اس نے سلویا سے بھی کچھ نہ کچھ کہا تھا۔ سلویا کی آنکھیں جھک

گئیں۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اس کے چہرے عجیب سی چمک تھی۔ شاید یہ خوشی کی چمک تھی۔ حالانکہ یہ موقع خوشی کا نہیں تھا۔ باغ پور میں چاروں طرف اندیشوں کے سائے تھے اور اسراریت کی جھاڑیوں میں خوف کے سانپ رینگ رہے تھے۔ ابھی آٹھ دس گھنٹے پہلے اسکول کے کھنڈر میں سلویا کی آنکھوں کے سامنے رازی جان کا قتل ہو چکا تھا اور اس کے کچھ دیر بعد میری آنکھوں کے سامنے شوکت بری طرح گھائل ہو چکا تھا لیکن جس طرح صحراؤں میں گلستان پائے جاتے ہیں اور لامتناہی سمندروں میں جزیرے اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہیں، اس طرح دکھ اور پریشانی کے سلسلوں میں بھی خوشی اور اطمینان کے چھوٹے چھوٹے پڑاؤ آتے رہتے ہیں۔ خوشی کو دکھ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور نہ دکھ کو خوشی سے۔

''کہاں گم ہوگئی ہو میم صاحب؟'' بابے صادق نے سلویا کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

''نن نہیں...... بابا جی ہام تو گم نہیں ہوا......''

''تو پھر تم کس سوچ میں پڑی تھی؟''

سلویا مسکرائی اور ایک دم بات بدلتے ہوئے بولی۔ ''ہام سوچ رہا تھا بابا......! کہ اس نائٹ کو گنے کی فیلڈ کے اندر آپ نے ہام کو بہت برار گرا دیا تھا۔ ہام کا کہنی اب تک درد کرتا ہے۔''

بابا صادق ہنسنے لگا۔ میں نے سلویا کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ ایک دو گھنٹوں کے اندر دو تین بہت ضروری کام کرنے ہیں۔''

گاؤں کی گلیوں میں ہراساں چہرے نظر آ رہے تھے۔ کھنڈر میں ہونے والے قتل کی خبر گلی کوچوں میں پھیلنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں یہ خبر پھیلنے والی تھی کہ ایک عجیب الخلقت شخص گاؤں کے آس پاس موجود ہے۔ کہیں گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ کسی کھیت میں موجود ہے یا کھنڈر کے اردگرد پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کو یہ بھی معلوم ہونے والا تھا کہ انسپکٹر شوکت کھنڈر میں زخمی ہونے کے بعد اسپتال پہنچ چکا ہے۔

تھانے پہنچتے ہی میں نے فربہ اندام چاند کو اپنے ساتھ لیا اور تحصیل اسپتال روانہ ہوگیا۔ شوکت کی مزاج پُرسی کرنا تھی اس کے علاوہ تازہ ترین صورتِ حال پر اس سے تبادلۂ خیال بھی کرنا تھا۔ ہم گیارہ بجے کے لگ بھگ اسپتال پہنچے۔ شوکت کے سر پر بڑی سی پٹی بندھی تھی۔ ایک بازو بھی پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ دونوں ہونٹ سوج کر بہت موٹے ہوگئے تھے۔ میری طرح شوکت نے بھی عجیب الخلقت شخص کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کی زبردست حیوانی قوت کا مشاہدہ کیا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا، وہی کچھ شوکت نے دیکھا تھا، ہم دونوں کے مشاہدات ملتے تھے۔ شوکت نے بتایا کہ حیوان نما شخص کی گرفت میں آنے کے بعد اس کے نتھنوں سے ایک نامانوس بو ٹکرائی اور پھر وہ اُڑتا ہوا سا دیوار سے جا ٹکرایا، اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ سنیئر ڈاکٹر نے شوکت کو بتایا تھا کہ ابھی اسے کم از کم دو دن مزید اسپتال رہنے کی ضرورت ہے۔

موجودہ حالات کے بارے میں میرے اور شوکت کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ درحقیقت میں یہاں آیا تو سیر و سیاحت کے لیے تھا لیکن اب پوری طرح اس انوکھے کیس میں INVOLVE ہو چکا تھا۔ ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے اس عجیب وغریب معاملے کی تہہ تک پہنچنا، میرے لیے بہت اہم ہو چکا تھا۔

میرے یہاں پہنچنے سے پہلے، اسکول کے کھنڈر میں ''کھوجی باپ بیٹا'' نے بھی اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔ کھوجیوں کے مطابق یہاں بھی اس چوڑے چکلے پاؤں کے نشان موجود تھے جو اس سے پہلے بدنصیب بشیرے کی لاش کے آس پاس گئے تھے اور بعد میں چاند والے واقعے میں بھی فیض محمد کے مویشیوں کے قریب دیکھے گئے تھے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو جاتی تھی کہ باغ پور میں پیش آنے والے یہ سارے واقعات ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان واقعات میں ''عجیب الخلقت شخص'' تسلسل سے موجود تھا۔ وہ حیوانی طاقت اور جنونی انداز سے خون بہا رہا ہے اور اپنے سامنے آنے والے ہر شخص پر جان لیوا حملہ کر رہا ہے۔

میں نے شوکت سے اس کی رائے پوچھی تو وہ بولا۔ ''یہ بات تو خارج از امکان ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر قتل کر رہا ہے۔ اس نے تین بندوں کو مارا ہے جب کہ ایک یعنی چاند بال

بال بچا ہے۔ پہلے قتل ہونے والے دونوں افراد یعنی بشیرے اور صغراں کے درمیان تو کوئی نہ کوئی تعلق موجود تھا۔ یعنی وہ دونوں دو پیار کرنے والوں کے راستے میں رکاوٹ تھے۔ سوچا جا سکتا ہے کہ اپنے راستے کو صاف کرنے کے لیے زبیدہ اور صلو نے ان دونوں کو مارنے کی سازش کی ہو لیکن چاند پر حملہ اور پھر شکاری رازی جان کا قتل بالکل علیحدہ معاملے ہیں۔ ان واقعات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاتل کی حیثیت ایک خونی درندے کے سوا کچھ نہیں وہ ان لوگوں میں سے ہے جو صرف اپنی اندرونی وحشت کی تسکین کے لیے خون ریزی کرتے ہیں۔

حوالدار فدا حسین بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ابھی تک اپنے اس مؤقف پر قائم تھا کہ ان واقعات کا تعلق بھوت پریت کی کارستانیوں سے ہے۔ کہنے لگا۔ ''جناب! کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہوائی چیزیں خون خرابا کرنے کے لیے دوسرے لوگوں کے اندر گھس جاتی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جو عجیب وغریب شکل کا بندہ ہے اس کے اندر بھی کچھ گھسا ہوا ہو، سچے سائیں جی فرمایا کرتے تھے......''

''تمہاری سوئی ایک ہی جگہ اٹکی رہتی ہے اس لیے تم چپ ہی رہو تو بہتر ہے۔'' شوکت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ یہ شخص کہیں سے بھاگا ہوا ہو اور اب عام لوگوں سے چھپتا پھر رہا ہو۔ اس صورت میں یہ بھوک سے تنگ آ کر بھی لوگوں پر حملے کر سکتا ہے۔ اگر اس کی حرکتیں انسانوں سے زیادہ درندوں سے ملتی جلتی ہیں تو پھر یقینی بات ہے کہ اس کی عادتیں بھی درندوں جیسی رہی ہوں گی۔ درندوں کے بارے میں طے ہے کہ وہ پہلے پہل بھوک سے تنگ آ کر ہی انسانوں پر حملے کرتے ہیں۔ بعد میں انہیں عادت پڑ جاتی ہے......''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ گوشت خور ہو سکتا ہے...... لیکن اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں ساری کی ساری لاشیں سلامت کیوں ملتیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''ویسے بھی یہ تصور افسانوی سا لگتا ہے کہ کوئی انسان...... آدم خوری کرنے لگے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب چاند پر حملہ ہوا

تو چاند ہمارے لیے بھنی ہوئی میٹھی دال لا رہا تھا۔تم جانتے ہی ہو جب یہ دال تازہ تازہ بنی ہوتی ہے اس کی خوشبو خاصی تیز ہوتی ہے۔کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ بھنے ہوئے چنوں کی خوشبو ہے۔جب چاند وہ دال لے کر وہاں سے گزر رہا تھا، وہ شخص قبرستان کی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ہوسکتا ہے کہ وہ خوشبو کی وجہ سے چاند پر جھپٹ پڑا ہو۔یہ شبہ اس وجہ سے بھی مضبوط ہوتا ہے کہ جب چاند ٹھوکر کھا کر گر گیا تو حملہ کرنے والے نے چاند تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔یہ عین ممکن ہے کہ وہ دال والی پتیلی کی طرف متوجہ ہو گیا ہو۔''

شوکت بولا۔''اگر ہم یہ مفروضہ درست مان لیں کہ وہ صرف بھوک کی وجہ سے لوگوں کی جان لے رہا ہے تو پھر لڑکی صغراں کا قتل کس کھاتے میں ڈالا جائے گا۔اسے کماد کے کھیت میں مارا گیا۔وہ جوان تھی اور پوری طرح بے بس بھی تھی لیکن اس کی عزت لوٹی گئی نہ اس سے کوئی شے چھینی گئی۔''

''مگر تم یہ بھول رہے ہو کہ صغراں کی لاش کے پاس بھی گنے کے چوسے ہوئے چھلکے موجود تھے۔ہوسکتا ہے کہ وہ شخص بھوک سے مجبور ہو کر گنے کے کھیت میں گھسا ہو۔صغراں نے اس کی ڈراؤنی شکل دیکھ کر چیخ پکار کی ہو۔اس نے گھبرا کر اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔''

حوالدار فدا حسین نے دوبارہ ٹانگ اڑاتے ہوئے کہا۔''سچے سائیں جی نے ایک بار بتایا تھا کہ جس بندے کو کوئی شے چمڑی ہوتی ہے اس کو بھوک بہت زیادہ لگتی ہے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''بھوک تو چاند کو بھی بہت لگتی ہے۔''

شوکت فوراً بولا۔''تو اس کو اس کی بیوی چمڑی ہوئی ہے ناں۔''

چاند نے برا نہیں منایا لگتا تھا کہ شوکت نے اس کے دل کی بات کی ہے۔

رازی جان کے قتل نے جو صورت پیدا کی تھی اس کے بارے میں ہمارے درمیان تفصیلی بات ہوئی۔چوہدری ارباب اور اس کے انگریز مہمانوں پر دباؤ برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ انہیں شاملِ تفتیش رکھا جاتا۔تاہم، شوکت نے حوالدار فدا حسین کے ذریعے اے ایس آئی نذیر کو یہ ہدایت بھیجی کہ چوہدریوں کے ساتھ نرمی سے بات کی جائے اور کوئی ایسا عمل نہ ہو جس سے چوہدریوں کے ساتھ تعلق بگڑنے کا اندیشہ ہو۔اس کے علاوہ شوکت نے یہ ہدایت بھی دی کہ رازی کے قتل کی ایف آئی آر نامعلوم حملہ آور

کے حوالے سے کاٹی جائے۔پُراسرار حملہ آور کے بارے میں شوکت کی رائے بھی وہی تھی جو میری تھی۔یعنی یہ ماضی کا کوئی عجیب الخلقت بچہ ہے جو اب پرورش پا کر ایک نہایت طاقتور اور خطرناک وجود کا روپ دھار گیا ہے۔کسی اخلاقی ضابطے کی پروا کیے بغیر وہ نہایت سفاکی سے خون بہا رہا ہے۔

سہ پہر چار بجے کے قریب ہم باغ پور واپس آ گئے۔باغ پور میں خوف و ہراس کی فضا پہلے سے گھمبیر ہو چکی تھی۔علاقے کے دو تین بااثر افراد نے مداخلت کی تھی جس کی وجہ سے رازی جان کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کرایا جا سکا تھا۔اس کی لاش قریبی گاؤں ''لالی'' روانہ کی جا چکی تھی۔رازی جان وہیں کا رہنے والا تھا۔

تھانے میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سرگودھا سے ڈی ایس پی اکرام شاہ صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں۔ان کے ساتھ دو تین اخباری نمائندے بھی باغ پور پہنچ رہے ہیں۔اس کا مطلب تھا کہ باغ پور کے تحیر خیز واقعات اخباری سرخیوں کا موضوع بننے والے ہیں۔جو چرچے پہلے مقامی سطح پر تھے، اب وہ دور و نزدیک پھیلنے والے ہیں۔

ڈی ایس پی صاحب کا پروگرام تبدیل ہوا اور وہ اگلے روز صبح سویرے گاؤں پہنچے۔رازی جان کے لواحقین ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت تک رازی کی آخری رسومات ادا کر چکے تھے۔اعلیٰ پولیس افسر اور اخباری نمائندوں کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف ہلچل محسوس ہوئی۔گاؤں کے لوگ اس بات پر بھی خوف زدہ تھے کہ کہیں اعلیٰ افسر کی آمد سے ان پر کوئی مصیبت نہ ٹوٹ پڑے (ان دنوں دیہات میں تفتیش کا طریقہ بے حد سخت بلکہ ظالمانہ ہوتا تھا۔بلکہ دور دراز دیہات میں اب بھی ایسا ہی ہے۔بپھرے ہوئے پولیس اہلکار ہر آتے جاتے دیہاتی کو پکڑ کر تفتیش میں بٹھا لیتے ہیں۔بلا تفریق ہر ایک کو چھتر لگائے جاتے ہیں۔بعض اوقات سرِ عام مار کھانے والوں کی تعداد بیسیوں ہوتی ہے۔اس طرح خوف و ہراس کی فضا پیدا کی جاتی ہے اور ملزم کو اقبالِ جرم پر مجبور کیا جاتا ہے)

خود میرا تعلق بھی چونکہ اخبار سے تھا اس لیے میں نے اخباری نمائندوں کو بہ آسانی سنبھال لیا۔میں نے انھیں اس ''سیریل کلنگ'' کے چیدہ چیدہ واقعات بتائے اور مقامی پولیس کی طرف سے قاتل کو پکڑنے کے لیے جو بھی کوششیں کی گئی تھیں انہیں اچھے طریقے

سے بیان کیا۔ ان کوششوں کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ انسپکٹر شوکت زخمی ہو
اسپتال میں تھا۔

ڈی ایس پی کے حکم پر زیرِ تفتیش افراد کو تھانے بلایا گیا۔ ان میں زبیدہ، صلو اور ر
کا والد بھی تھا۔ زبیدہ اور صلو خاص طور سے بہت پریشان تھے۔ زبیدہ سیاہ چادر میں لپ
تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بچہ اس کی گود میں تھا۔ ڈی ایس پی صاحب نے اس سے چند سوا
پوچھے۔ وہ ہر سوال کے جواب میں یہ فقرہ ضرور شامل کرتی رہی...... ''صاحب جی! ا
میرا صلو سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔''

درحقیقت اب خوب روز بیدہ اور صلو والا معاملہ کافی حد تک غیر اہم ہو چکا تھا۔ ا
یہ بات تقریباً ثابت تھی کہ کھنڈر کے آس پاس موجود ''جنونی شخص'' کسی بھی پلاننگ کے
بغیر قتل کر رہا ہے۔ ابھی ڈی ایس پی صاحب زیرِ تفتیش افراد سے سوال جواب کر ہی رہے
تھے کہ چاند تیزی سے چلتا ہوا اندر آیا۔ اس کی موٹی توند تھل تھل کر رہی تھی اور چہرے
بھی زلزلے کے آثار تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ شوکت کا یہ چہیتا مخبر آج پھر کو
بری خبر لایا ہے۔ حوالدار فدا حسین بھی اس کے ساتھ تھا۔ فدا تو ہر وقت ہی ڈرا ہوا نظر آ
تھا۔ آج کچھ اور بھی ڈرا ہوا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ یہ بری خبر کسی کے
مرنے کی نہ ہو اور اگر مرنے والے کی ہے تو کم از کم قتل ہونے کی نہ ہو۔ لگتا ہے کہ یہ قبولیت
کی گھڑی نہیں تھی۔ میری دونوں دعائیں قبول نہیں ہوئیں۔ خبر مرنے کی تھی، بلکہ قتل ہو
کی تھی، اس بار گاؤں کے ہر دل عزیز کمپاؤنڈر رحمت کی جان گئی تھی۔ رحمت کا تذکرہ میں
نے اس روئداد کے شروع میں کیا ہے۔ وہ باغ پور کا واحد ایلو پیتھک معالج تھا۔ سماجی
کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اس کا کلینک تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ باغ
پور سے تقریباً دو کوس دور ایک چھوٹا اسپتال بھی موجود تھا مگر رحمت کے کلینک کی رونق سدا
بہار تھی۔ آس پاس کے دیہات سے بھی مریض رحمت کے پاس آتے تھے۔

میں اور نذیر چاند کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ رحمت مر گیا ہے۔
جیتا جاگتا، ہنستا کھیلتا شخص جو باغ پور کی روزمرہ زندگی کا اہم جزو تھا۔ ابھی تین چار دن
پہلے وہ مجھ سے اور شوکت سے اپنی شادی میں شرکت کی درخواست کر رہا تھا۔ اس کی

پُرزور خواہش تھی کہ میں اس کی شادی میں ضرور شرکت کروں...... لیکن ہم دونوں نے انکار
کر دیا تھا۔ ایک تو باغ پور کے حالات ٹھیک نہیں تھے، دوسرے رات کو ایک دور کے دیہہ
میں جانا تھا۔

چاند کی اطلاع سننے کے بعد کئی لمحوں تک میں کچھ بول نہیں سکا پھر ہمت جمع کر کے
میں نے چاند سے کہا۔ ''لل...... لیکن اس کی تو شادی تھی؟'' سوال بے معنی تھا لیکن مجھے
کوئی بات سوجھ ہی نہیں رہی تھی۔

حوالدار فدا حسین نے ہاتھ کی پشت سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر
آواز میں بولا۔ ''ہاں جناب! وہ رات ہی اپنی دلہن کو لے کر واپس پہنچا تھا۔'' اتنا کہہ کر
حوالدار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بات تھی بھی بڑے دکھ کی۔ ایک خوشیوں بھرے گھر
میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ ایک مانوس اور ہر دل عزیز چہرہ باغ پور کے گلی کوچوں سے ہمیشہ
کے لیے اوجھل ہو گیا تھا۔

''اس کی لاش دیکھی نہیں جاتی جناب!'' حوالدار فدا حسین نے کہا۔ ''یہ اسی
درندے کا کام ہے جی! جس نے پہلے قتل کیے ہیں۔''

ڈی ایس پی سمیت باقی لوگوں کے چہروں پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ ہم تو خیر
کئی دنوں سے ان پُراسرار حالات کے کرب کا شکار تھے لیکن نئے آنے والوں کو ایک دم
''خوف'' کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے وہ پیلے پڑ گئے تھے۔ چوہدری ارباب اور اس کے
دو انگریز مہمان بھی اس وقت تھانے میں موجود تھے۔ ان کے چہروں پر بھی اس تازہ خبر
کے بعد ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایک عجیب سا خوف تھا جو فضا میں تیر رہا تھا اور جسموں میں
سرایت کر رہا تھا۔

ڈی ایس پی کی قیادت میں ہم اس وقت شادی والے گھر میں پہنچے۔ یہاں کہرام مچا
ہوا تھا۔ رحمت کے گھر کے اندر اور باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ رحمت کا کلینک گھر کے اندر ہی
واقع تھا۔ نیک خو رحمت کی ناگہانی موت پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ گھر کے اندر سے بَین کی
آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ غمگین تو تھے ہی تاہم، ان کی آنکھوں میں گہرے خوف کی......
پرچھائیاں بھی رقصاں تھیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ ہجوم میں عورتیں اور بچے خال خال ہی

دکھائی دیتے تھے۔ اکثر لوگ منہ میں کچھ بڑبڑاتے اور پڑھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اِس
صورتِ حال کا سبب وہ خوف تھا جس نے پچھلے چند دنوں کے اندر اس علاقے کو ایک
آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا تھا اور اب گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اپنی گرفت مضبوط کر
جا رہا تھا۔ یہ حالات ''ذمے دار'' افراد کے لیے نہایت تکلیف دہ اور پریشان کن تھے اور
کسی حد تک میں بھی ذمے دار افراد میں شامل ہو چکا تھا۔ اخباری رپورٹروں کی آنکھوں
میں تجسس کی چمک تھی۔ ان کے قلم دھڑا دھڑ اپنی نوٹ بکس پر چل رہے تھے اور ایک نیوز
فوٹوگرافر کھٹا کھٹ تصویریں بنا رہا تھا۔ ان لوگوں کے ہاتھ ایک سنسنی خیز اسٹوری آ گئی
تھی۔

ہم گھر کے اندر داخل ہوئے تو مقتول رحمت کی والدہ دھاڑیں مارتی ہوئی اے
ایس آئی نذیر سے لپٹ گئی اور بین کرنے لگی۔ ڈی ایس پی کی موجودگی میں بھی وہ
جاری نذیر کو ہی بڑا افسر سمجھ رہی تھی۔ ڈی ایس پی اکرام شاہ نے آگے بڑھ کر عورت کو تسلی
دی۔ رحمت کی لاش ایک سوتری چارپائی پر رکھی تھی۔ لاش پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی
ڈی ایس پی نے چادر ہٹائی۔ میرے تمام خدشات حقیقت میں بدل گئے۔ یہ قتل بھی بالکل
اسی انداز میں ہوا تھا جس میں پہلے تین قتل ہوئے تھے۔ مقتول کو گردن دبا کر ہلاک کیا گیا
تھا۔ اس کا منہ حسرت ناک انداز میں کھلا تھا اور گردن کی جلد پر دباؤ کے نیلگوں نشان
تھے۔ ان نشانات کے علاوہ جسم پر کوئی زخم یا نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ معائنے کے
لیے مقتول کے سارے جسم پر سے چادر ہٹا دی گئی۔ اس کی کہنیوں اور ٹخنوں وغیرہ پر
خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نوجوان مقتول نے دم توڑنے سے پہلے
خاصی جدوجہد کی ہے۔ یہ چھوٹی بڑی خراشیں اس کے تڑپنے اور مچلنے کی نشان دہی کرتی
تھیں۔ مقتول کے جسم پر فقط ایک ڈبی دار دھوتی تھی۔ بالائی جسم عریاں تھا۔ سر اور پاؤں
بھی ننگے تھے۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی کی سرخی تھی اور یہ منظر اس کی موت کو اور بھی درد
ناک بنا رہا تھا۔ یہ ہنستا بولتا چہرہ میں نے باغ پور کے گلی کوچوں میں کئی بار دیکھا تھا۔ ناک
پر چھوٹا سا تل...... روشن آنکھیں اور ہمدرد لب و لہجہ...... وہ ہر ایک کے کام آنے والا شخص
تھا۔ آج خود کام آ گیا تھا۔

گھر والوں نے رحمت کی لاش کو زمین سے اٹھا کر خود چارپائی پر ڈالا تھا۔ اِدھر اُدھر
گھوم کر انہوں نے بیشتر زمینی شہادتیں ضائع کر ڈالی تھیں۔ ڈی ایس پی نے گھر کے سربراہ
یعنی رحمت کے والد سے چند سوال پوچھے۔ وہ جواب دیتے ہوئے ہچکیوں سے رو رہا تھا
اور بار بار اپنی پیشانی پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ برات دلہن کو لے
کر شام کے بعد ہی واپس پہنچی تھی۔ جن مہمانوں کا تعلق باغ پور سے تھا وہ اپنے اپنے
گھروں کو چلے گئے تھے مگر دوسرے دیہات کو جانے والے مہمان ٹھہر گئے تھے۔ رحمت
نے خود ہی کہا تھا کہ حالات ٹھیک نہیں لہٰذا جنھوں نے جانا ہے وہ کل کھانا کھانے کے بعد
دوپہر کے وقت چلے جائیں۔ رات گھر میں پچیس کے قریب مہمان موجود تھے۔ ان میں
زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔ رات نو بجے کے بعد رحمت اپنی دلہن کے پاس کمرے میں
چلا گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد سب لوگ سو گئے۔ تھکے ماندے تھے اس لیے گہری نیند
سوئے تھے۔ رات پچھلے پہر ڈھائی تین بجے کا وقت ہوگا جب شور اٹھا اور بہت سے گھر
والے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ رحمت کے کمرے کی طرف سے دلہن کی چیخیں سنائی دے رہی
تھیں۔ رحمت کے والد نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا۔ ''جناب عالی، میں سب سے پہلے
موقع پر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ میری بہو عصمت دروازے میں کھڑی چیخ پکار کر رہی ہے۔
اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ
کر جھنجوڑا اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا لیکن وہاں
اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ زمین بھی خالی تھی۔ اتنے میں میری گھر والی بھی دوڑتی
ہوئی پہنچ گئی۔ میری بہو اس سے لپٹ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ میری بیوی نے چیخ کر
پوچھا، عصمت...... رحمت کہاں ہے؟ مگر وہ بس روتی چلی جا رہی تھی۔ اتنے میں ایک
دوسری عورت نے رحمت کو دیکھ لیا۔ اس نے چیختے ہوئے ہمیں بلایا۔ میں لالٹین لے کر اس
طرف بھاگا۔ ورانڈے کے پاس جہاں لکڑی کی الماری ہے زمین پر کچھ پڑا تھا۔ میں نے
نیچے جھک کر دیکھا، یہ میرے پتر کی لاش تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔''

رحمت کے بدنصیب والد کا بیان ختم ہوا اور فضا پھر آہوں اور نالوں سے بوجھل ہو
گئی۔ رحمت کی آنکھیں تارے لگی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا

کہ وہ کئی گھنٹے پہلے اس ہنستی بستی دنیا سے ناتا توڑ چکا ہے۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ قتل بھی اسی انسان نما درندے کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کل رات جب وہ کھنڈر سے بھاگا تو کماد کے کھیتوں میں چھپتا چھپا گاؤں کے شمال کی طرف چلا گیا۔ یہاں بھی اونچے قد کی فصل موجود تھی۔ اس کے علاوہ بھ اس خونی کے چھپنے کے لیے کئی جگہیں تھیں۔ گزر جانے والی شب کو وہ گاؤں کی طرف آیا۔ بے شک گاؤں میں ٹھیکری پہرا لگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ہر شخص چوکنا بھی تھا، مگر بدقسمت رحمت کا گھر گاؤں کے بالکل سرے پر واقع تھا۔ یہ گھر عقبی جانب سے خاصا غیر محفوظ بھ تھا۔ اس طرف زمین کا ایک خالی قطعہ تھا جہاں عورتیں کوڑا کرکٹ وغیرہ پھینک جاتی تھیں۔ کوڑا کرکٹ پھینکنے کی وجہ سے رحمت کے گھر کی بیرونی دیوار کافی نیچی لگنے لگی تھی۔ دیوار کی حالت دیکھ کر فوراً اندازہ ہو گیا کہ رحمت نے یہ دیوار حال ہی میں ڈھائی تین فٹ مزید اونچی کی تھی، مگر اب بھی یہ اتنی اونچی ہرگز نہیں تھی کہ اسے پھاندنا مشکل ہوتا۔ میں ''خونی'' کی وحشیانہ طاقت اور پھرتی کو بڑے قریب سے ''ملاحظہ'' کر چکا تھا۔ جسمانی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس میں کسی گوریلے کی سی جھلک تھی۔ وہ یقیناً اسی جانب سے گھر میں داخل ہوا تھا۔ کھوجی باپ بیٹا بھی موقع پر آ موجود ہوئے تھے۔ انہوں نے کچی دیوار پر ایسے نشان ڈھونڈ لیے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ رات کو یہ دیوار پھاندی گئی ہے۔

اس واردات میں اہم ترین شہادت مقتول کی بیوی کی تھی۔ وہ واردات سے پہلے یکسر تنہا، مقتول کے ساتھ موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ دونوں اپنی شبِ عروسی منا رہے تھے۔ وہ بدنصیب ایک رات کی دلہن تھی۔ دیر تک بے ہوش رہنے کے بعد وہ آدھ پون گھنٹا پہلے ہی سنبھلی تھی۔ ابھی بھی اس کی حالت اس قابل تو نہیں تھی کہ اس سے سوال جواب کیے جاتے لیکن یہ پولیس کی مجبوری تھی۔ مقتول کے والد نے سکتہ زدہ بہو کو بہ مشکل آمادہ کیا کہ وہ ڈی ایس پی صاحب کے سوالوں کے جواب دے۔

گھر ہی کے ایک کمرے میں مکالمہ ہوا۔ چند گھنٹے پہلے یہ کمرا حجلۂ عروسی تھا لیکن اب یہاں کی ہر چیز سے سوگواری اور اداسی ٹپک رہی تھی۔ کچی دیوار پر ایک کھونٹی سے رحمت کا سنہری تاروں والا سہرا لٹکا ہوا تھا۔ رنگین پایوں والی خوب صورت مسہری پر گلاب کی کملائی

ہوئی پتیاں تھیں۔ ایک میز پر شیشے کے پھول دار جگ میں دودھ پڑا تھا۔ دو گلاسوں میں بھی بچا کھچا دودھ موجود تھا۔ ایک پلیٹ میں مٹھائی ڈھکی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ڈی ایس پی صاحب نے پوچھ گچھ کے لیے جان بوجھ کر اس کمرے کا انتخاب کیا تھا۔ ایک تفتیش کار کی حیثیت سے وہ موقع واردات پر موجود ہر شے کا بہ غور جائزہ لینا چاہتے تھے۔

مسہری کے قریب ہی جست کا بنا ہوا ایک ٹرنک پڑا تھا۔ ٹرنک کے ڈھکنے پر خون کے قطرے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ڈی ایس پی کی توجہ ان دو چار قطروں کی طرف دلائی۔ ڈی ایس پی نے پہلے تو مقتول کی دلہن کو تسلی و تشفی دی۔ وہ ذرا سنبھل گئی تو انہوں نے دلہن سے کہا کہ وہ واقعے کی تفصیل بتائے تاکہ اس کے دلہا کے قاتل کو جلد سے جلد پکڑا جا سکے۔

کمرے میں اس وقت ڈی ایس پی کے علاوہ میں اور نذیر بھی موجود تھے۔ لڑکی کا سُسر عبدالرحمٰن ایک گوشے میں چپ بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل سترہ اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں گجرا پھیلا ہوا تھا۔ کلائیاں چوڑیوں سے خالی تھیں۔ سادہ سے کپڑوں میں وہ بے چارگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر پتا چل جاتا تھا کہ وہ رو رو کر ہلکان ہو چکی ہے۔ اس کی آنکھیں اب خشک تھیں لیکن ہچکی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس نے خود پر بہ مشکل قابو پایا اور ڈی ایس پی اکرام کے سوالوں کے جواب دینا شروع کیے۔ نوحہ کناں آواز میں اس نے کہا ''جج...... جب کسی نے کمرے کے دروازے کو ہلایا تو...... ہم جاگ رہے تھے۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ ہوا کی وجہ سے دروازہ ہلا ہے۔ پھر دوسری بار دروازہ ہلا۔ اس بار کافی آواز آئی۔ وہ اٹھنے لگے تو میں نے سوچا کہ انہیں روک لوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا لیکن میرے سوچتے سوچتے وہ دروازے کی طرف چلے گئے۔ لالٹین بند تھی اندھیرے میں مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور پھر اچھی طرح باہر جھانکنے کے بعد دوبارہ بند کر دیا۔ میں نے اندھیرے میں ان کی چپل کی آواز سنی، وہ واپس مسہری کی طرف آ رہے تھے۔ ابھی وہ مسہری تک پہنچے نہیں تھے کہ دروازہ پھر بجنے لگا۔ وہ واپس پلٹ گئے......'' یہاں تک کہہ کر رحمت کی دلہن پھر ہچکیوں سے

رونے لگی۔ یقیناً وہ اندوہناک مناظر ایک بار پھر پوری تفصیل کے ساتھ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے تھے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور پورا جسم کانپتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے اشک بار سُسر نے محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اسے حوصلہ دلانے کی کوشش کی۔

کچھ دیر تک اپنی قسمت کو رونے کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''وہ دروازے کی طرف چلے گئے۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی، مجھے لگا کہ وہ دروازے سے باہر چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ بس ایک دو بار تھوڑی سی آہٹ سنائی دی۔ ایک دو منٹ اور گزر گئے، پھر کوئی آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں آ گیا...... میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ...... ''ان'' کے بجائے کوئی دوسرا ہوگا...... لیکن...... لیکن جب...... اس نے......مم...... مجھے ہاتھ لگایا تو مجھے فوراً اندازہ ہو گیا۔ میں اتنی گھبرائی کہ مجھے لگا، بے ہوش ہو جاؤں گی۔ میں نے کہا ''کون ہے؟'' جواب میں وہ خبیث مجھ سے چمٹ گیا اور......اور......'' لڑکی نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے مہندی لگے ہاتھوں میں اپنا دکھی چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

اس سے آگے کا بیان نازک تھا۔ وہ بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ میں نے نذیر کو اشارہ کیا اور خود بھی اٹھ گیا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ڈی ایس پی صاحب اندر ہی موجود رہے اور بیان مکمل کرانے کی کوشش کرتے رہے۔ پانچ دس منٹ بعد انہیں اپنی کوشش میں کامیابی ہوئی۔ لڑکی نے باقی کی تفصیلات بتا دیں۔ بعدازاں یہ تفصیلات، ڈی ایس پی صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچیں...... لڑکی نے بتایا تھا...... وہ شخص اس سے لپٹ گیا اور زبردستی کرنے لگا۔ لڑکی کو اس نے چارپائی پر گرا لیا تھا اور اس کے منہ کو اپنے مضبوط ہاتھ سے بند کر دیا تھا۔ اسی دوران میں لڑکی کی ناتواں مزاحمت کو ایک سہارا مل گیا۔ یہ پیتل کا ایک وزنی گلدان تھا جو پاس ہی تپائی پر پڑا تھا۔ اس نے پوری قوت سے یہ گلدان حملہ آور کے سر پر مارا۔ ایک لمحے کے لیے لڑکی پر حملہ آور کی گرفت کمزور ہو گئی۔ لڑکی نے تڑپ کر خود کو آزاد کرایا اور مدد کے لیے چیخنے لگی۔ حملہ آور نے ایک زناٹے کا تھپڑ لڑکی کے منہ پر مارا اور اٹھ کر باہر کو بھاگا۔ وہ گرتی پڑتی دروازے تک آئی تو وہ تاریکی

میں اوجھل ہو چکا تھا۔ مقتول کے والد عبدالرحمٰن نے چیخ کر پوچھا کہ کیا ہوا؟ لڑکی نے انگلی سے دیوار کی طرف اشارہ کیا لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ اتنے میں مقتول کی والدہ یعنی لڑکی کی ساس بھی روتی چلاتی ہوئی پہنچ گئی۔ لڑکی اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی پھر روتے روتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔ ڈی ایس پی صاحب اس معاملے میں میری گہری دلچسپی ملاحظہ کر رہے تھے۔ میرے ساتھ ان کا مکمل تعارف بھی ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں انگریزی اخبار کے کرائم رپورٹر کے طور پر بھی کام کر چکا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ''اسلم صاحب! آپ بھی اس سے کچھ پوچھیں۔'' ان کا اشارہ رحمت کی دلہن کی طرف تھا۔

لڑکی عصمت اب کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ صرف اس کا سُسر عبدالرحمٰن وہاں موجود تھا۔ میں نے سرگوشی میں عبدالرحمٰن سے کہا۔ ''چاچا جی! یہ آپ کی بہو ہے تو میری بہن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک دو منٹ اس سے اکیلے میں بات کروں۔ ہوسکتا کہ یہ آپ کی موجودگی کے سبب کچھ باتیں چھپا رہی ہو......''

عبدالرحمٰن کو میری بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ کسی کی بات سننے کے بہانے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے بڑے خلوص سے عصمت کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''میری بہن! تمہارے بیان کے ذریعے ہم جلد سے جلد قاتل تک پہنچ سکتے ہیں، کچھ بھی چھپاؤ مت۔ میں ہاتھ جوڑ کر تم سے درخواست کرتا ہوں۔''

اس نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا۔ یوں لگا جیسے میری بات اس نے پر اثر کیا ہے۔ اس نے پلکیں گرائیں۔ رخساروں پر موٹے آنسو لڑھکنے لگے۔ میں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ میرا اپنا دل بھی بھر آیا تھا۔ ڈی ایس پی صاحب نے دس منٹ کی کوشش سے اسے بولنے پر آمادہ کیا تھا، میں نے دو چار منٹ میں کر لیا۔ باوردی پولیس آفیسر کی نسبت وہ میرے سامنے خود کو زیادہ مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ ایک دو عمومی سوال پوچھنے کے بعد میں نے اس سے دریافت کیا۔ ''کیا واقعی تم خونی کو بالکل نہیں دیکھ سکی ہو؟''

''اندھیرا بہت تھا۔ بب......بس مجھے اس کا پرچھاواں نظر آ رہا تھا۔'' وہ بولی۔

"اندازاً وہ کتنی دیر تم سے گتھم گتھا رہا؟"

"بس ...... ایک ...... آدھ منٹ......" عصمت نے سہما ہوا جواب دیا۔ اس کا جواب واضح کرتا تھا کہ جنونی شخص نے عصمت پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش تو کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

"کیا تمہیں پتا تھا کہ باغ پور میں ایک خطرناک قاتل گھوم رہا ہے اور لوگوں پر حملے کر رہا ہے؟"

"ہاں ...... پتا تھا۔ میرے ابے اور بھائی نے مجھے کچھ باتیں بتائی تھیں لیکن زیادہ شاید اس لیے نہیں بتایا تھا کہ کہیں میں ڈر ہی نہ جاؤں۔"

"جب رات کو تم پر حملہ ہوا، تو تمہارے دل میں خیال آیا کہ کہیں یہ وہی جنونی قاتل نہ ہو۔"

"نہیں۔ اس وقت میرے دماغ میں یہ بات بالکل نہیں آئی۔ اس وقت تو...... میرا دماغ جیسے بالکل بند ہو گیا تھا۔"

"تم نے کہا ہے کہ وہ کچھ دیر تک تم سے گتھم گتھا رہا۔ کیا تمہیں اس کے جسم میں کچھ عجیب لگا۔"

وہ کچھ دیر تک ذہن پر زور ڈالتی رہی، پھر الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ "نہیں، مجھے کچھ یاد نہیں۔ بس...... اس کے جسم سے بو کے بھبکے سے اٹھ رہے تھے...... اتنا ہی یاد ہے مجھے......"

حالات اور واقعات واضح طور پر اس عجیب الخلقت جنونی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ جستی ٹرنک پر نظر آنے والے خون کے قطرے قاتل ہی کے تھے۔ پیتل کا وزنی گلدان لگنے سے یقیناً اس کے سر پر زخم آیا تھا۔

اے ایس آئی نذیر نے ڈی ایس پی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "سر، لگتا ہے کہ مجرم کے سر پر آنے والی چوٹ کافی گہری ہے۔ خون کے قطرے کمرے سے باہر بھی پائے گئے ہیں۔ بلکہ کھوجی دوست محمد نے گھر سے باہر بھی دو چار قطرے دیکھے ہیں...... وہ اور اس کا بیٹا اب کھیتوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔"

ڈی ایس پی صاحب فوراً نذیر کے ساتھ باہر آ گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ رکوع کی حالت میں جھکا ہوا کھوجی دوست محمد بڑے کلاسیکل انداز میں کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر کھڑا تھا اور کھرا اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا بھی تن دہی سے ساتھ دے رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ دور کھڑے بڑے انہماک سے ان دونوں ہنر مندوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ کھوجی باپ بیٹا کی گاؤں میں بہت عزت ہے۔ ان کا درجہ شاید پیری فقیری کے درجے سے تھوڑا ہی کم تھا۔ حوالدار فدا حسین نے مجھے بتایا تھا کہ کھوجی دوست محمد میں حیرت انگیز صلاحیتیں ہیں اور یہ صلاحیتیں صرف دوست محمد کے ساتھ ہی خاص نہیں ہیں، اکثر تجربے کار کھوجی غیر معمولی طور پر ہنر مند ہوتے ہیں۔ فدا نے بتایا تھا کہ دوست محمد مویشی کا کھرا دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ وہ نر ہے یا مادہ۔ حاملہ ہے یا غیر حاملہ۔ جانوروں کے فضلے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتا ہے کہ وہ کتنی دیر پہلے یہاں سے گزرا ہے۔ اس نے کس علاقے کا چارا کھایا ہے...... وغیرہ وغیرہ۔

کھوجی باپ بیٹا نے ڈی ایس پی صاحب کو بتایا کہ رات آخری پہر ہونے والی ہلکی بارش کی وجہ سے کھرا خراب ہو گیا ہے اور اٹھایا نہیں جا رہا۔ تاہم، انہوں نے خون کے چھوٹے بڑے دھبے ڈھونڈ لیے تھے اور اب دھبوں کے سہارے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی مہارت کی داد دینا پڑی تھی۔ وہ بھربھری مٹی اور سبزی مائل پتوں پر ایسے دھبے بھی دیکھ رہے تھے جنہیں خالی آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال ایک دو جگہوں پر واضح سرخ نشان بھی دکھائی دیے، جن سے پتا چلا کہ کھوجی باپ بیٹا درست رخ پر جا رہے ہیں۔ جوں جوں ہم لوگ کھیتوں کے درمیان آگے بڑھتے گئے دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ میں نے دیہاتیوں کے درمیان جیکب، ہارڈی اور سلویا کو بھی دیکھا۔

وہ تینوں بھی کھوجیوں اور پولیس اہلکاروں کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ سلویا کے لمبے شہد رنگ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ روپہلی کرنوں میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ میری اور اس کی نگاہیں گاہے گاہے ملتی تھیں اور ایک برق سی کوند جاتی تھی۔ یہ کیسی تبدیلی تھی؟ سلویا کو دیکھ کر میرے سینے میں یہ کیسی ہلچل مچتی تھی؟ "کیا یہ وہی شہرۂ آفاق جذبہ ہے جسے محبت کہا جاتا ہے اور اس کے علاوہ بھی ہزار ہا نام دیے جاتے ہیں۔" میں حیرت

سے سوچ رہا تھا۔ مجھے ماننا پڑے گا کہ پچھلے چند دن سے میری نگاہیں ہر وقت سلویا کو ڈھونڈتی رہتی تھیں اور شاید ...... دوسری طرف بھی اس سے ملتی جلتی کیفیت تھی۔ اب بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ ہماری نظریں بار بار ایک دوجے کو تلاش کرتی تھیں اور ملتی تھیں لیکن ہماری نظروں کے درمیان ایک نظر اور بھی تھی۔ یہ ہارڈی کی نظر تھی۔ میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھے تیکھی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ایک بار میں نے اسے سلویا کو بھی گھورتے ہوئے پایا۔ اس کے انداز میں ناراضی اور تنبیہ تھی۔ جیسے سلویا سے کہہ رہا ہو ''خبردار۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی ایرے غیرے دیسی کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔''

حوالدار فدا حسین بھی میری دائیں جانب چل رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد تھا۔ اسے اور چاند کو پختہ یقین تھا کہ ہم سب ایک ''کارِلاحاصل'' میں الجھے ہوئے ہیں۔ تلاش کرنے اور کھرے اٹھانے سے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ کسی ملنگ، سادھو یا پیر فقیر کی قدم بوسی کی جائے اور اس سے مسئلہ حل کرنے کے لیے دست بستہ عرض کی جائے۔ کھوجیوں کے پیچھے جاتے ہوئے فدا حسین اپنے سر کو بار بار مایوسی کے عالم میں ہلاتا تھا اور منہ سے ''چچ چچ'' کی آواز نکالتا تھا جیسے کھوجیوں، پولیس والوں اور اخباری نمائندوں کی حالت پر ترس کھا رہا ہو اور یہ کیفیت صرف فدا حسین اور چاند ہی کی نہیں تھی۔ میرے قیافے کے مطابق باغ پور کی ساٹھ فی صد آبادی کے خیالات وہی تھے جو فدا اور چاند کے تھے۔ میری اطلاع کے مطابق گاؤں کے بیشتر لوگوں نے اپنے گھروں کی بیرونی چوکھٹ پر تعویذ وغیرہ باندھ رکھے تھے۔ بچوں کے بازوؤں پر بھی تعویذ اور امام ضامن وغیرہ دکھائی دیتے تھے۔ کچھ لوگ نذر نیاز کے چکر میں تھے، گاؤں کی دونوں مساجد میں بھی ان حادثات کے سبب رونق دکھائی دیتی تھی۔ مخبر چاند کی پیش گوئی تھی کہ آج سہ پہر تک گاؤں کے دس پندرہ گھرانے نقل مکانی کر جائیں گے ...... اور عین ممکن ہے کہ پھر یہ سلسلہ چل نکلے۔

بہر حال ان ساری باتوں سے قطع نظر فی الوقت جو لوگ موقع پر موجود تھے ان میں سخت جوش اور غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے کمپاؤنڈر رحمت کی حسرت ناک موت دیکھی تھی اور اس کے گھر والوں کے کرب ناک بین سنے

تھے۔ یہ ساری ٹھوس حقیقتیں تھیں اور ان کا تعلق کسی آسیب سے جوڑنا فوری طور پر ان لوگوں کا ذرا مشکل نظر آتا تھا۔ کھوجیوں اور پولیس والوں کے پیچھے پیچھے چلتا، ہجوم اب جوہڑ کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ یہ جوہڑ کافی بڑے رقبے میں واقع تھا۔ گاؤں کی عورتیں یہاں کپڑے دھوتی تھیں، لڑکے بالے نہاتے تھے اور ایک دو بار میں نے انہیں یہاں مچھلیاں پکڑتے بھی دیکھا تھا۔ اس جوہڑ کے ایک طرف کافی زیادہ رقبے میں سرکنڈے کھڑے تھے۔ سرکنڈے عام طور پر خاصے گھنے اور طویل ہوتے ہیں۔ جب تیز ہوا چلتی ہے تو ان کے سفیدی مائل بالائی سرے سے بڑی خوب صورتی سے ہلکورے لیتے ہیں۔ اس وقت بھی ہوا چل رہی تھی اور سرکنڈے ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔

مخبر چاند نے مجھے ان سرکنڈوں کے بارے میں ''بریفنگ'' دیتے ہوئے کہا۔

''کچھ سال پہلے ایک ڈاکو پنڈ میں واردات کر کے ان سرکنڈوں میں چھپ گیا تھا۔ جب لوگ اسے پکڑنے کے لیے سرکنڈوں کے اندر گھسے تو اس نے کاربین سے فائرنگ شروع کر دی۔ اس فائرنگ سے تین بندے مارے گئے اور وہ دوڑ گیا۔''

فدا حسین بولا۔ ''جناب! اس وقت سے گاؤں کے لوگ ان سرکنڈوں کے اندر جانے سے گھبراتے ہیں۔ خاص طور سے بچے اور عورتیں تو اس طرف بالکل نہیں آتے۔ کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ رات کے وقت ان سرکنڈوں کی طرف سے ٹھاہ ٹھاہ کی آوازیں آتی ہیں، حالانکہ اندر کوئی نہیں ہوتا۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی کوئی سایہ ہو؟'' میں نے کہا۔

فدا حسین میرے طنز کو سمجھے بغیر بولا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے جناب! جو لوگ دردناک طریقے سے مرتے ہیں ان کی روحیں مرنے والی جگہ پر چکراتی رہتی ہیں۔ دو تین مہینے پہلے رمضان تیلی کے بیٹے فیض محمد نے یہاں سے گزرتے ہوئے رونے دھونے کی آوازیں سنی تھیں۔''

''حالانکہ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔'' میں نے فدا حسین کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل جی!'' اس نے سر ہلا کر تائید کی۔

کھوجی باپ بیٹا بڑی ہنر مندی سے اپنا سفر مکمل کر چکے تھے۔ انہوں نے پورے

وثوق سے کہا کہ زخمی جو کوئی بھی ہے، ان سرکنڈوں کے اندر گیا ہے۔ ڈی ایس پی اکرام شاہ نے مقامی پولیس اہلکاروں سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد باغ پور اور قریبی دیہات کے چار پانچ معززین کو بھی اس مشورے میں شامل کیا گیا۔ چوہدری ارباب بھی ان میں موجود تھا۔ سب کی رائے یہی تھی کہ ان سرکنڈوں کو نرغے میں لے کر قاتل کو گرفتار کیا جائے اور کسی بھی صورت یہاں سے نکلنے نہ دیا جائے۔ زندہ یا مردہ، ہر دو صورتوں میں اس کی گرفتاری اشد ضروری تھی۔ بات وہی تھی جو ابھی میں نے اوپر بیان کی ہے۔ جنونی قاتل کی تازہ ترین واردات نے ہر شخص کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گاؤں کے ہر باشندے کو بلکہ کہنا چاہیے، علاقے کے ہر باشندے کو اپنی جان اور آبرو خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ وہ اس سفاک کو جلد از جلد اپنی گرفت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے چند لمبے تڑنگے افراد کا ایک گروہ دیکھا۔ ان کے ہاتھوں برچھیاں اور لمبے دستے کی کلہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کے رنگ نسبتاً سیاہی مائل تھے۔ چاند نے مجھے بتایا کہ یہ افراد ہلاک ہونے والے شکاری جان رازی کے رشتے دار ہیں۔ یہ سب لوگ غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ جب تک خونی پکڑا نہیں جاتا، وہ اپنے کاموں پر واپس جائیں گے اور نہ ہی اپنے گاؤں میں۔

دیکھتے ہی دیکھتے جوہڑ کے کنارے کافی مجمع ہو گیا۔ جوں جوں نئے واقعے کی خبر گرد و نواح میں پھیل رہی تھی۔ لوگوں کی سراسیمگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کھیتوں میں کام بند ہو گیا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ کھیت مزدور کندھوں پر بیلچے اور کسیاں اٹھائے، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر چلتے جوہڑ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آدھ پون گھنٹے میں وہاں چار پانچ سو کے قریب افراد جمع ہو گئے۔ ڈی ایس پی سے مشورے کے بعد چوہدری ارباب ایک بیل گاڑی کے اوپر کھڑا ہو گیا اور اس نے لوگوں کو بتایا کہ سرکنڈوں میں ہانکا کیا جائے گا اور خونی کو اس کی پناہ گاہ سے باہر نکالا جائے گا۔ اس نے ہانکے کے حوالے سے لوگوں کو اہم ہدایات دیں اور سمجھایا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

سرکنڈوں کو دو طرف سے جوہڑ نے گھیر رکھا تھا، دو اطراف خالی تھیں۔ انگریز جیکب نے ڈی ایس پی کو مشورہ دیا کہ ہانکا صرف ایک طرف سے کیا جائے، ایک طرف مسلح نوجوانوں کو لمبی قطار کی شکل میں کھڑا کر دیا جائے۔ میں نے بھی اس تجویز کی تائید کی۔ اس طرح افراتفری سے بچا جا سکتا تھا۔ تھوڑے سے غور و خوض کے بعد ڈی ایس پی اکرام شاہ نے یہ تجویز مان لی۔ چوہدری ارباب نے پھر سے بیل گاڑی پر کھڑے ہو کر نئے پروگرام کا اعلان کیا۔ مزید ہدایات دیتے ہوئے اس نے کہا کہ خونی کو زندہ پکڑنے کی کوشش کی جائے گی لیکن اگر اس کے بھاگ جانے کا خطرہ ہو تو اسے مارنے سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ تمام لوگ ایک قطار کی شکل میں آگے بڑھیں گے۔ اگر قاتل مل جاتا ہے اور ہانکا کرنے والوں پر حملہ آور ہوتا ہے تو ہانکا کرنے والے پیٹھ نہیں دکھائیں گے...... وغیرہ وغیرہ۔

ڈی ایس پی نے یہ کام میرے ذمے لگایا کہ میں دیہاتیوں میں سے چالیس پچاس ہوشیار نوجوان منتخب کروں اور انہیں سرکنڈوں کی بائیں جانب کھڑا کروں۔ میں نے یہ کام اچھے طریقے سے انجام دیا۔ میں نے قریباً پینتالیس نوجوان چنے۔ ان سب کے پاس برچھیاں، تلواریں اور کلہاڑیاں تھیں۔ دو نوجوان تھری ناٹ تھری سے بھی لیس تھے۔ مشورے کے بعد انگریز ہارڈی بھی اپنی بارہ بور کی بندوق سمیت ان نوجوانوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ چوہدری ارباب اپنے بیٹے عالمگیر اور آٹھ دس مزارعوں کے ساتھ جوہڑ کے عین کنارے پر تھا۔ اگر ہانکے کے نتیجے میں قاتل جوہڑ میں چھلانگ لگانے کی کوشش کرتا تو جوہڑ کے کنارے پر موجود دستے سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ناکے بند کیے جا چکے تو باقی سب لوگ ہانکا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ چھپے ہوئے درندے کا خوف ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے لیکن یہاں تو عجیب صورتِ حال تھی۔ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ہم جس شے کو اپنے گھیرے میں لانا چاہتے ہیں وہ اصل میں ہے کیا؟ انسان ہے؟ انسان نما درندہ ہے یا درندہ نما جنونی ہے۔ بے شک میں کھنڈر کی طلسمی رات میں اسے دیکھ چکا تھا لیکن اسے دیکھنے اور چھونے کے باوجود اس کا اسرار جوں کا توں تھا۔

ڈی ایس پی کے اشارے پر دیہاتی ایک قوس کی شکل میں دور تک پھیل چکے تھے پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق ہانکا شروع ہوا۔ ڈی ایس پی اکرام نے سرکاری ریوالور سے ہوائی فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی لوگ کنستر بجانے لگے، ڈھول پیٹنے لگے۔ اس کے

ساتھ ساتھ وہ جوہڑ کی طرف بھی بڑھ رہے تھے۔ میری بائیں طرف جیکب اپنی طاقت ور رائفل لیے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں شکاری چمک تھی۔ اس کی ہر جنبش پیشہ ور شکاری کا انداز لیے ہوئی تھی۔ ہمارے عقب میں اور دائیں بائیں شور ہی شور تھا۔ برچھیاں چمک رہی تھیں۔ کلہاڑیاں لہرا رہی تھیں۔ کسی ایک ذی نفس کے لیے اتنا بڑا ہانکا میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ صورتِ حال اس دہشت کی غماز تھی جو اوپر تلے حادثات رونما ہونے کے بعد علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہم سرکنڈوں کے بیچوں بیچ گزر رہے تھے۔ راستے میں ایک مستطیل گڑھا سا تھا۔ میں اسے پھاندنے کے لیے ایک قدم پیچھے ہٹا تو میری پشت کسی گداز وجود سے ٹکرائی۔ اس کی ساتھ ہی خوشبو کا جھونکا محسوس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، عقب میں سلویا تھی۔ وہ حسب معمول پتلون اور جرسی میں تھی۔ اس نے فل بوٹ پہنے رکھے تھے اور بڑی بے باکی سے رائفل تھامی ہوئی تھی۔ اتفاقیہ تصادم کی وجہ سے اس کے دودھیا چہرے پر شفق کا رنگ بکھر گیا۔ یہ بالکل مشرقی انداز تھا۔ وہ ذرا لجا کر بولی ''سوری!'' شور کے سبب اسے بلند آواز میں بولنا پڑا تھا۔

''یہ لفظ تو مجھے کہنا چاہیے تھا۔'' میں نے بھی بلند آواز میں کہا۔

''تو آپ کہہ لیں۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

''سوری۔''

''ڈزنٹ میٹر!'' اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

یقیناً وہ مضبوط اعصاب کی مالک، ایک مشکل پسند لڑکی تھی۔ ورنہ موجودہ سچویشن میں مسکرانا اس کے لیے خاصا دشوار ثابت ہوتا۔ ہمارے چاروں طرف سراسیمگی کی فضا تھی اور کان پھاڑ دینے والا شور تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہے۔ کوئی اہم بات...... لیکن اسی دوران میں اس کی نگاہ جیکب کی طرف اٹھ گئی۔ وہ سلویا ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلویا جیسے ٹھٹک سی گئی۔ اس کے ٹھٹکنے کا خفیف انداز مجھ سے پوشیدہ نہیں رہا۔
اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں مزید کچھ سوچتا، ہانکا کرنے والی طویل قطار کی دائیں جانب شور بلند ہوا اور ''پکڑو...... مارو'' کی آوازیں آئیں۔

تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ ایک چھوٹا جنگلی سؤر نظر آیا تھا۔ لوگوں نے اسے برچھیوں اور لاٹھیوں سے مار ڈالا ہے۔

ہانکا جاری رہا۔ ہم محتاط قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔ ایک ایک انچ زمین کو دیکھا جا رہا تھا۔ کئی جگہ سرکنڈے چودہ پندرہ فٹ تک بلند تھے۔ ان کے اندر پانی کھڑا تھا اور کہیں کہیں سبز کائی دکھائی دے رہی تھی۔ ہانکا بڑے منظم طریقے سے ہو رہا تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ اگر قاتل یہاں موجود ہے تو آج بچ نہیں سکے گا۔

میں نے اردگرد دیکھا سلویا اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ جیکب کے ساتھ آگے نکل گئی تھی...... یا جیکب اُسے جان بوجھ کر آگے لے گیا تھا۔ مجھے ذرا دیر پہلے کا دلکش تصادم یاد آیا اور میری کمر پر ایک گداز حرارت دوڑنے لگی...... پھر یہ حرارت پورے جسم میں سرایت کرتی محسوس ہوئی اور سینے میں دل کے مقام پر ایک میٹھا میٹھا درد جمع ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر مجھے سلویا کی نگاہیں یاد آئیں۔ مجھے لگا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی اہم بات کہنا چاہتی ہے۔ یہ میرا وہم تھا یا واقعی اس کے ہونٹوں میں کوئی بات دبی ہوئی تھی۔ کہیں اس بات کا تعلق باغ پور کے پُر اسرار حالات سے تو نہیں تھا؟ یا اس عجیب الخلقت قاتل سے جس کی تلاش میں ہم خطرناک سرکنڈوں کے اندر آگے بڑھ رہے تھے۔

ہانکا جاری رہا۔ قریباً ایک فرلانگ کے ہانکے میں دو سؤر، ایک مشتعل کتا اور ایک سانپ دیہاتیوں کی لاٹھیوں اور برچھیوں کا نشانہ بنے...... لیکن وہ نہیں ملا جس کی تلاش تھی۔

جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ سوڈیڑھ سو گز آگے، جوہڑ کے کنارے کھڑا دستہ پوری طرح چوکس تھا۔ اگر قاتل، ہانکے کے نتیجے میں جوہڑ میں چھلانگ لگاتا تو بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔

اس وقت ہم جوہڑ سے صرف پچیس تیس گز کی دوری پر تھے...... جب سرکنڈوں میں سامنے کی طرف تیز سرسراہٹ کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی سیاہ چیز تیزی سے ہانکا کرنے والوں پر جھپٹی۔ ایک ساتھ کئی چیخیں گونجیں۔ چوہدری ارباب اور ڈی ایس پی اکرام شاہ کی تمام ہدایات بیکار گئیں۔ ہمارے آگے چلنے والے سات آٹھ نوجوان منہ

پھیر کر بھاگے۔ گھیرا ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے جیکب کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد جو دوسرا منظر میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ایک ریچھ نما حیوان، سلویا کے ہاتھ سے رائفل چھین رہا ہے۔ سلویا کی چیختی ہوئی آواز ابھری پھر وہ اور سلویا ایک ساتھ ہی زمین پر گرے۔ ہاپل کرتے سرکنڈوں میں بس ان دونوں کی جھلکیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ میرے ہاتھ میں ریوالور اور جیکب کے ہاتھ میں رائفل تھی مگر ہم سلویا کے خیال سے گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے، ایسی ڈرامائی صورتِ حال تھی کہ حواس جواب دے رہے تھے۔

اچانک، پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں سارے خطرات کو بالائے طاق رکھتا ہوا سلویا اور ریچھ نما انسان کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں سرکنڈوں میں اس طرح الجھ گئے تھے کہ نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ میری نگاہ سلویا کی رائفل پر پڑی۔ وہ گیلی زمین پر خودرو گھاس میں الجھی ہوئی تھی۔ میں نے ریوالور بیلٹ میں اڑس کر رائفل اٹھائی۔ اسے بیرل کی طرف سے پکڑا اور لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے عجیب الخلقت شخص کے زیریں دھڑ کو نشانہ بنایا۔ میں نے رائفل کا چوبی دستہ حملہ آور کی سیاہ جلد سے ٹکراتے دیکھا۔ یہ جلد بھینس کے چمڑے کی طرح موٹی تھی اور اس پر بال تھے۔ حملہ آور کا باقی جسم سرکنڈوں اور گھاس میں چھپا ہوا تھا۔ خوب رو سلویا اس کے نیچے بری طرح دبی ہوئی تھی۔ مجھے بس اس کی ایک ٹانگ ہی نظر آ رہی تھی۔ نوجوانوں کے بھاگ اٹھنے سے اردگرد موجود سارے لوگوں میں ہراس پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سخت اضطراری کیفیت میں پیچھے ہٹ گئے تھے، جیکب سمیت ابھی تک کسی نے قریب آنے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن پھر مجھے ایک شخص نظر آیا۔ اس کے چہرے پر منڈاسا اور ہاتھ میں برچھی تھی۔ وہ بڑی دلیری سے میری مدد کو لپکا۔ اس نے تیزی سے اپنی برچھی کے ساتھ ''سیاہی مائل وجود'' پر حملہ کیا۔ ایک نامانوس کراہ بلند ہوئی۔ جیسے کوئی جانور غضب میں آ کر چنگھاڑے تب میں نے عجیب الخلقت شخص کے ایک بازو کو حرکت کرتے دیکھا، برچھی بردار اس بازو کی لپیٹ میں آ کر گرا۔ میرے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ میں نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے کھٹاک کھٹاک سے دو شدید ضربیں حملہ آور کے سر کے پچھلے حصے پر لگائیں۔ اسی دوران میں چند بھاگ نکلنے والے نوجوان بھی سنبھل کر پلٹ پڑے۔ کھٹاک کھٹاک کی آواز سے لاٹھیاں ریچھ نما شخص پر برسنے لگیں۔ خدا کی پناہ......

ایک ناقابل فراموش منظر تھا اور ناقابل یقین تھا۔ چار بازوؤں اور بہت بڑے سر والا عجیب الوضع شخص فقط چند قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔ وہ سلویا کو چھوڑ کر سرکنڈوں میں ابھر آیا تھا۔ میں ایک بار پہلے بھی اسے دیکھ چکا تھا لیکن تب رات کا وقت تھا۔ اب دن کی روشنی میں وہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک جیتی جاگتی حقیقت۔ اس کی جلد سیاہ اور مضبوط تھی۔ تمام جسم پر گھنے بال تھے اور وہ کسی جنگلی بھینسے کی طرح طاقت ور تھا۔ اس کا سر بالکل گول نہیں تھا۔ اس میں دو ابھارے تھے۔

چند لاٹھیاں کھا کر وہ مخالف سمت میں بھاگا لیکن اس دوران میں لوگ خوف کے شدید جھٹکے سے سنبھل چکے تھے۔ لاٹھی برداروں کی ایک اور ٹولی نے آگے بڑھ کر حملہ آور کا راستہ روکا۔ چند نوجوان جوش کے عالم میں اس پر پل پڑے۔ غم و غصے سے لوگوں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عجیب الخلقت شخص کو پچھاڑ لیا گیا۔ اب وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک لنگوٹی نما کپڑے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مشتعل دیہاتیوں کی برچھیاں اسے روئی کی طرح دھنک رہی تھیں۔ اگر ان لوگوں کو چند لمحے مزید نہ روکا جاتا تو شاید وہ اسے جان سے مار ڈالتے۔ ''رک جاؤ...... رک جاؤ......!'' میں لاٹھی برداروں پر چیخا اس کے ساتھ ہی میں نے چند نوجوانوں کو ہاتھ سے روکنے کی کوشش کی۔

لاٹھی برداروں کے ہاتھ سست پڑ گئے۔ ڈی ایس پی اکرام شاہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے ''مجرم'' کو گرفت میں لے لیا۔

میں اور جیکب سلویا کی طرف لپکے۔ وہ خود ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی پشت کائی زدہ پانی سے بھیگی ہوئی تھی۔ گردن پر گہری خراشیں تھیں۔ وہ ہانپ رہی تھی بہرحال حوصلے میں تھی۔

ہماری توجہ ایک بار پھر ''عجیب الخلقت'' پر مرکوز ہو گئی۔ اسے چار پانچ صحت مند پولیس اہلکاروں نے پوری قوت سے زمین پر ہی دبا رکھا تھا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور جسم کے کئی حصوں سے خون نکل رہا تھا۔ موجودہ حالت میں وہ اس قابل نہیں لگتا تھا کہ مزاحمت کر سکے، پھر بھی اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ یہ عجیب سا خوف تھا۔ اس میں گھن اور

کراہت بھی شامل تھی۔ میں نے ''عجیب الخلقت'' کا چہرہ دھیان سے دیکھا۔ اس کا چہرہ عام انسانوں سے مشابہ تھا لیکن معمول سے کہیں بڑا تھا۔ چہرے کا حجم دیکھ کر ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اس کا سر عام انسانی سر سے کم وبیش ڈھائی گنا بڑا تھا اور خاصا بدہیئت تھا۔ بہ غور دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے، دو سروں نے باہم مل کر ایک سر کی شکل اختیار کر لی ہو۔ گردن ناپید تو نہیں تھی لیکن بہت چھوٹی اور موٹی تھی۔ طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ مٹکے جیسا سر کندھوں کے اوپر ہی رکھا ہے۔ اس کی پشت پر کندھوں سے ذرا نیچے ایک بڑا ابھار تھا۔ عجیب الخلقت شخص کے دو زائد بازو اسی ابھار سے پیوست تھے۔ پورے جسم کی طرح ان بازوؤں پر بھی بالوں کی بہتات تھی۔ وہ اپنی خون آلود آنکھیں جھپک جھپک کر لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے غور سے اس کی سفیدی مائل آنکھوں میں دیکھا اور...... میرے اندر اچانک ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ ایکا ایکی میرا بیشتر خوف اور کراہت دور ہو گئی۔ سارا منظر تبدیل ہوتا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک ڈرا ہوا معصوم جانور میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کا سارا بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ ایک ران سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں برچھی بردار نے ضرب لگائی تھی۔

ہجوم ہمارے اردگرد موجود تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوف منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم، اس خوف کے باوجود ان کے چہرے غیظ وغضب سے تمتما رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ ہر آنکھ میں ابھی تک کمپاؤنڈر رحمت کی لاش کا منظر ٹھہرا ہوا ہے۔ پولیس والوں کے روکنے کے باوجود گاہے گاہے کوئی مشتعل شخص ہجوم سے نکلتا تھا اور لاٹھی ''حملہ آور'' کے سر پر دے مارتا تھا۔ ہر بار جب لاٹھی اس کے سر یا پشت پر لگتی تھی۔ وہ کسی جانور ہی کی طرح بدک جاتا تھا۔ تکلیف یا غصے کی کوئی جھلک اس کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔

میرے ذہن میں ہمدردانہ خیالات ابھر رہے تھے لیکن چند سیکنڈ بعد میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کچھ بھی تھا اور وہ ایک بے رحم خونی تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے شب کی تاریکی میں اس نے ایک بے گناہ نوجوان کو عین سہاگ رات میں قتل کیا تھا اور اس کی دلہن پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی تھی۔ اس سے پیشتر بھی وہ تین افراد کو بے رحمی سے قتل کر

چکا تھا۔

ایک دیہاتی سن کی طویل رسی لے کر آگے بڑھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے رسی لی اور پولیس اہلکاروں کے ساتھ مل کر بڑی مضبوطی سے اس شخص کی مشکیں کس دیں۔ اس کے حلق سے بس ایک دو بار چنگھاڑ کی سی آواز نکلی، اس کے سوا اس نے اور کچھ نہیں کیا۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی بو کو محسوس کر کے مجھے کھنڈر کی رات یاد آ گئی جب اس جنونی سے میرے دو دو ہاتھ ہوئے تھے (بلکہ اسے دو اور چار ہاتھ کہنا چاہیے) حملہ آور کی مشکیں اچھی طرح کسی جا چکیں تو لوگوں کا خوف مزید کم ہو گیا۔ وہ ایک دائرے کی شکل میں جمع ہونے لگے۔ ہمارا دھیان اس شخص کی طرف گیا جس نے نازک وقت میں دلیری کا مظاہرہ کیا تھا اور برچھی سونت کر حملہ آور پر جھپٹا تھا۔ یہ جان کر سب کو حیرت ہوئی کہ وہ باہمت شخص کوئی جوانِ رعنا نہیں تھا۔ ایک سفید ریش بوڑھا تھا۔ وہی بابا صادق جس کے چہرے پر جوانوں کی سی سرخی تھی اور جس کے پوپلے منہ میں ہر وقت مسکراہٹیں چمکتی تھیں۔ جہاں طاقت ور جوانوں کی ناتجربے کاری نے انہیں ہراساں کر دیا تھا، وہاں اس بوڑھے کی تجربہ کاری نے اسے ہمت اور استقامت دی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے لوگوں کی مخالف سمت میں بھاگا تھا اور میری مدد کو پہنچا تھا۔

دیہاتیوں کی تعریفی نظریں مجھ پر اور بابے صادق پر تھیں۔ کئی بڑے بوڑھوں نے میرے شانے تھپکے۔ خود بابے صادق نے بھی میری تعریف میں کچھ کہا اور اپنی چھوٹی چھوٹی شوخ آنکھوں کو مٹکایا۔

ڈی ایس پی نے کہا۔ ''ویل ڈن مسٹر اسلم اور ویل ڈن بابا جی...... آپ کا نام کیا ہے بابا جی؟''

اہلِ علاقہ کی تعریفی نگاہیں محسوس کر کے میرے سینے میں فخر انگڑائیاں لے رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ وہ کیا چیز تھی جس نے عین موقع پر مجھ سے درست فیصلہ کرایا اور میں ہمت کر کے حملہ آور پر جھپٹ پڑا۔ اس سوال کا جواب بڑا واضح تھا۔ میرے اقدام کی اہم ترین وجہ میرے دل کا موسم تھا (وہ چمکیلا موسم جو باغ پور کی دھواں دھواں فضا میں چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا ہوا، میرے دل میں اترا تھا) اس موسم نے میرے جسم کو عجیب سی طاقت

اورحرارت بخش دی۔ میں نے سلویا کی کراہیں سنیں۔ میرے اندر کی طاقت اور حرارت برق بن گئی اور میں درجنوں دوسرے لوگوں کی طرح سکتہ زدہ رہنے کے بجائے حملہ آور پر جھپٹ پڑا۔

میری نگاہیں سلویا کی تلاش میں اِدھر اُدھر گردش کرنے لگیں اور پھر وہ جیکب اور ہارڈی کے پیچھے کھڑی نظر آ گئی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی اور شاید اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ میں اس کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں اس نے میری چوری پکڑ لی تھی۔ نگاہیں ملیں تو مسکرا اٹھیں۔ یہ بڑی پیاری سی آنکھ مچولی تھی۔ سلویا کی نگاہوں میں تشکر کی جھلک بھی تھی۔ جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو۔ ''شکریہ...... تم نے میرا اتنا خیال کیا...... شکریہ!''

ہماری نظروں کے ملاپ کو شاید بہت کم لوگ دیکھ رہے تھے۔ ہر نگاہ اس عجیب الوضع وجود پر تھی، جو رسیوں میں جکڑا نم زمین پر پڑا تھا اور حلق سے گونج دار آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا لیکن شانوں اور کولہوں کی چوڑائی غیر معمولی تھی۔ یہ چوڑائی دیکھ کر اس کی بے پناہ جسمانی طاقت کا اندازہ بہ خوبی کیا جا سکتا تھا۔ لوگ اسے دیوانہ وار دیکھ رہے تھے اور چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ قدرت نے اسے کیا بنایا ہے۔ یہ انسان ہے یا انسان کی بگڑی ہوئی شکل ہے؟ اس قسم کے اَن گنت سوال اٹھائے جا رہے تھے۔ عجیب الخلقت شخص کے بال دیکھ کر مجھے وہ بال یاد آ گئے جن کا ذکر بد نصیب صغراں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موجود تھا۔ قریباً چار انچ لمبے بال مقتولہ کی گردن سے چمٹے ہوئے پائے گئے تھے۔ یہ بال سو فی صدی اسی حیوان نما انسان کے تھے۔

ڈی ایس پی صاحب رکوع کے بل اس شخص سامنے جھکے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ چھڑی سے اس شخص کو ٹہوکا دیتے تھے اور بار بار پوچھتے تھے۔ ''کون ہے تو...... کہاں سے آیا ہے؟''

جواب میں اس شخص کے خون آلود ہونٹوں سے بس ناقابل فہم آوازیں نکل کر رہ جاتی تھیں ''غوں غوں...... غاں غاں...... خرخر......'' ان آوازوں میں اذیت آمیز ناراضی کی جھلک تھی۔ کسی وقت وہ بے ساختہ اپنے جسم کو جنبش دیتا تھا۔ جیسے اپنی غیر معمولی

جسمانی طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے بندشوں کو توڑنا چاہتا ہو لیکن بندشیں بہت مضبوط تھیں۔ تماشائیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ سینکڑوں لوگ سرکنڈوں میں داخل ہو چکے تھے اور اس سے کہیں زیادہ تعداد سرکنڈوں سے باہر تھی۔ یہ لوگ اس انتظار میں تھے کہ قاتل کو سرکنڈوں سے باہر لایا جائے۔

کچھ دیر بعد گاؤں کے دائرے سے ایک جہازی سائز کی چارپائی منگوائی گئی۔ اس چارپائی کی چوڑائی قریباً چھ فٹ اور لمبائی دس فٹ کے قریب تھی۔ یہ پنچایت میں استعمال ہونے والی چارپائی تھی۔ درجنوں افراد نے مل کر عجیب الخلقت شخص کو اٹھا کر چارپائی پر رکھا اور رسی کی مدد سے اسے مضبوط چارپائی کے ساتھ باندھا گیا۔ تب لوگوں نے چارپائی کو اٹھایا اور ایک بڑے جلوس کی صورت میں واپس گاؤں کو روانہ ہوئے۔ یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ چارپائی سے بندھا ہوا بد وضع وجود گاہے گاہے سینے سے طیش بھری آوازیں نکالنے لگتا تھا اور اپنے جسم کو جارحانہ انداز میں جنبش دیتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ جیکب اور ہارڈی سائے کی طرح سلویا کے ساتھ ہیں۔ اب پتا نہیں یہ اتفاق تھا یا وہ شعوری طور پر سلویا کو اپنے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ گاؤں کے راستے میں بھی ایک دو بار میری اور سلویا کی نگاہ ملی۔ ہر بار مجھے یہی لگا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ میں انگریزی اچھی طرح بول اور سمجھ لیتا ہوں۔ شاید وہ اسی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، میرے کچھ گوش گزار کرنا چاہتی تھی۔ رہی میری بات...... تو میں تو سرتاپا اس کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کو قریب سے دیکھنے...... اس سے باتیں کرنے اور اسے چھونے کی خواہش میرے دل میں بے طرح مچل رہی تھی۔ باغ پور کی سراسیمہ فضا میں محبت کی کونپل کھلی تھی اور اسی سراسیمہ فضا میں پروان چڑھ رہی تھی۔ ہاں محبت کی روئیدگی کا کوئی موسم نہیں ہوتا اور نہ اس کے لیے کوئی خاص زمین ہوتی ہے۔

عجیب الوضع قاتل رسیوں میں جکڑا ہمارے سامنے کچے فرش پر پڑا تھا۔ یہ تھانے کا ایک کمرا تھا جو تفتیش وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ڈی ایس پی اکرام شاہ سمیت قریباً نصف درجن پولیس آفیسر اس کمرے میں موجود تھے۔ دو اخباری نمائندے بھی کسی نہ

کسی طرح اندر گھس آئے تھے۔ تھانے کے باہر سینکڑوں لوگوں کا ہجوم تھا۔ مجرم سے ''پوچھ گچھ'' ہو رہی تھی۔ یہ بڑی عجیب وغریب پوچھ گچھ تھی بلکہ اسے مضحکہ خیز کہنا چاہیے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم کسی جانور سے یہ توقع کر رہے ہیں کہ وہ باتیں کرے اور ہمارے سوالوں کے جواب دے۔ وہ اپنی سفید سفید خالی آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ کسی وقت دفعتاً اس کے منہ سے رال بہنے لگتی تھی۔

وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے۔ اس نے یہ قتل وغارت کیوں کیا ہے؟ یہ وہ سوال تھے جن کا جواب سب جاننا چاہتے تھے، لیکن جواب کہیں نہیں تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں اس نے فقط چند الفاظ بولے تھے۔ عجیب گونج دار آواز میں کہے ہوئے وہ الفاظ یہ تھے ''...... ناں ناں...... ہاں ہاں...... جا...... اموں...... اموں......'' یہ ناقابلِ فہم الفاظ بھلا ہماری کیا مدد کر سکتے تھے۔

وہ جسمانی طور پر اتنا خوفناک تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا گزرنے کے باوجود اس کی خوفناکی نگاہوں میں سما نہیں رہی تھی۔ جو پہلی مرتبہ اسے دیکھتا تھا اس کا منہ کھلا رہ جاتا اور آنکھیں دہشت سے پھیل جاتی تھیں۔ دھیان سے دیکھنے کے بعد اس کے جسم کی کچھ اور تفصیلات بھی سامنے آ رہی تھیں۔ سر کی مناسبت سے اس کا چہرہ بھی غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ آنکھوں کا درمیانی فاصلہ خوفناک حد تک زیادہ تھا۔ چار بازوؤں میں سے دو زیادہ مضبوط تھے اور ان پر بال بھی زیادہ تھے۔ ٹانگیں بھی بے حد توانا تھیں اور پنڈلیاں بھی کسی حد تک ٹیڑھی تھیں جیسے ''ٹھگنے'' لوگوں کی ہوتی ہیں۔ اس کی ناک کسی گوریلے کی ناک سے مشابہ تھی۔

وہ دو تین بار ایک دم مشتعل نظر آنے لگا۔ اس نے نہایت غصیلی نظروں سے اردگرد موجود افراد کو گھورا اور اپنی بندشوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ جارحانہ کوششیں سنسنی خیز تھیں۔ خاص طور سے آخری کوشش کے موقع پر تو کئی افراد گھبرا کر باہر نکل گئے۔

ڈی ایس پی صاحب کے حکم پر قاتل کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ اس کی ران سے مسلسل خون رِس رہا تھا، اس زخم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کے سر کے زخم بھی اہم تھے۔ یہ تین زخم تھے۔ ان میں سے دو تو واضح طور پر لاٹھیوں کے تھے، تاہم ایک زخم ایسا تھا جسے ''تیز دھار''

کہا جا سکتا تھا۔ یاد رہے کہ رحمت کی دلہن کا بیان تھا کہ اس نے حملہ آور کے سر پر گلدان سے ضرب لگائی تھی۔ ڈی ایس پی صاحب نے اس زخم کا غور سے معائنہ کیا۔ اس زخم کو گلدان کی ضرب کہا جا سکتا تھا اور نہیں بھی۔ بہرحال یہ زخم زیادہ تازہ نہیں لگتا تھا۔

ڈی ایس پی صاحب اپنے دو ماتحتوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور اخباری رپورٹروں کو اس بارے میں ضروری تفصیلات بتائیں۔ بعد ازاں مجھے اور کھوجی دوست محمد کو بھی اس میٹنگ میں بلا لیا گیا۔ ابھی یہ میٹنگ جاری تھی کہ شوکت بھی باغ پور پہنچ گیا۔ وہ سیدھا تحصیل اسپتال سے آ رہا تھا۔ اس کے سر پر ابھی تک میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی اور کندھے کی وجہ سے بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ شوکت بھی اس اہم میٹنگ میں شریک ہو گیا۔ شوکت نے کھنڈر میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے گوش گزار کیے۔ بہرحال اس نے چوہدری اور اس کے مہمانوں کے سلسلے میں محتاط رویہ اختیار کیا اور اخبار والوں کے سامنے ان کے متعلق کوئی منفی بات نہیں کی۔

یہ میٹنگ ختم ہوئی اور اخبار والے تصویریں وغیرہ لے کر فارغ ہو گئے تو ڈی ایس پی اکرام شاہ نے تنہائی میں شوکت سے تفصیلی ملاقات کی۔ اس ملاقات سے پہلے میں نے شوکت کو مشورہ دیا کہ وہ ڈی ایس پی کو چوہدری ارباب اور اس کے مہمانوں کے مشکوک رویے کے بارے میں ضرور بتائے لیکن مجھے محسوس ہوا کہ شوکت شاید لاشعوری طور پر چوہدریوں سے مرعوب ہے۔ وہ ان کے ساتھ اپنا معاملہ خراب کرنا نہیں چاہتا، کم از کم اس وقت تک جب ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل جائے۔

واپس سرگودھا روانہ ہونے سے پہلے ڈی ایس پی اکرام نے گرفتار شدہ ملزم کی حفاظت کے سلسلے میں خصوصی تاکید کی۔ انہوں نے شوکت کو ہدایت کی کہ ''ملزم'' کے والی وارثوں کا کھوج لگانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

جس وقت شوکت وغیرہ ڈی ایس پی اکرام اور اخباری نمائندوں کو رخصت کر رہے تھے، بابا صادق چپکے سے میرے پاس آیا۔ اس نے بڑی خاموشی کے ساتھ ایک رقعہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اپنے پوپلے منہ کو حرکت دے کر اس نے رازداری سے کہا۔ ''یہ میم صیب کی طرف سے ہے۔ وہ کسی ضروری کام کے لیے تم سے ملنا چاہتی ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ میں نے رقعہ کھول کر دیکھا۔ خوب صورت انگریزی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔ ''مسٹر اسلم! میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ یہ بے حد ضروری ہے۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میں آپ کے ساتھ رازداری سے بات کرسکوں۔ بہتر ہے کہ یہ ملاقات آج ہی ہو۔ وقت اور جگہ کے بارے میں بھی آپ ہی کو بتانا ہے۔''

میں نے اس مختصر تحریر کو دو تین بار پڑھا پھر بابے صادق سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بابا جی! تمہارا کیا خیال ہے۔ میم جی مجھ سے کس سلسلے میں ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔''

بابے صادق نے معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں پتر...... ویسے ایک بات میں جانتا ہوں، میم جی اچھی کڑی ہے۔ کسی اچھی ماں کی دھی ہے۔''

میں کچھ دیر تک سوچ بچار کرتا رہا۔ تب میں نے کہا کہ شام چھ بجے حویلی کے پچھواڑے مویشیوں والے احاطے میں آ جاؤں گا۔ میم جی بھی وہاں آ جائیں تو ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں نے بابا صادق سے کہا کہ اگر میم جی کو یہ تجویز پسند آ جائے تو میں پروگرام کے مطابق پہنچ جاؤں گا۔ دوسری صورت میں وہ مجھے آ کر بتا دے کہ میم جی کیا کہتی ہیں۔

بابا صادق واپس نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پروگرام فائنل ہو گیا ہے اور سلویا چھ بجے مجھ سے احاطے میں ملے گی۔ یہ وہی احاطہ تھا جہاں چند دن پہلے بھی سلویا سے ایک خوب صورت ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے سلویا کا بھینس کے دودھ میں بھیگا ہوا گریبان اور دل گداز منظر یاد آ گیا جب اس نے اپنے دل کی دھڑکنیں گنوانے کے لیے میرا ہاتھ اپنے جسم پر رکھ لیا تھا۔

شام تک میرا ذہن سلویا میں ہی الجھا رہا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ٹھیک پونے چھ بجے میں احاطے میں پہنچ گیا۔ تاریکی پھیل چکی تھی۔ احاطے میں اس وقت بابے صادق اور اس کے ایک بھتیجے کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میں ایک دو بار پہلے بھی چہل قدمی کرتا ہوا احاطے کی طرف آ چکا تھا۔ بھینس اور بکری کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی اچھل کود دیکھ

مجھے اچھا لگتا تھا، اس کے علاوہ بابے صادق کی باتیں بھی مزہ دیتی تھیں۔ میں احاطے میں پہنچا تو رنگیلا بابا صادق ایک گوشے میں بیٹھا نظر آ گیا۔ ایک نوجوان بھی اس کے پاس بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر بابے صادق نے نوجوان کو باہر بھیج دیا۔ مجھے اشارے سے بتایا کہ میں اندر چلا جاؤں۔ بابے کا اشارہ سمجھتے ہوئے میں اونچی چھت والے ایک لمبوترے گودام میں آ گیا۔ یہاں ایک طرف بھوسے کے بہت سے گٹھے پڑے تھے۔ ایک گوشے میں ڈیزل کے ڈرم دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لالٹین کی روشنی اس گودام کے بس تھوڑے سے حصے کو روشن کر پا رہی تھی۔

میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ سلویا کیسے اور کدھر سے آئے گی۔ اگر کوئی غیر متعلق شخص مجھے یہاں دیکھ لیتا تو مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی، بہرحال بابے صادق کے ہوتے ہوئے مجھے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ گودام کی ایک کھڑکی زمین سے قریباً سات فٹ بلند تھی۔ کھڑکی کی دوسری طرف نیچی چھت کا ایک ڈھارا سا تھا۔ یہ ڈھارا حویلی کے عقبی صحن سے ملتا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ سلویا اس جانب سے آئے گی لیکن وہ اسی جانب سے آئی۔ گھڑی کی سوئیاں ٹھیک چھ بجے کا وقت بتا رہی تھیں، جب کھڑکی کھلی اور مجھے کسی کا ہیولا نظر آیا۔ دھیان سے دیکھا تو وہ سلویا تھی۔ وہ کھڑکی میں جھکی ہوئی تھی۔ اس کے لمبے بال آگے کی طرف جھول رہے تھے۔ میرا دل یک بارگی ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے دھڑک اٹھا۔

میں آگے بڑھا۔ سلویا کھڑکی میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ گودام کا فرش کافی نیچا تھا۔ وہ چھلانگ لگاتی تو پاؤں وغیرہ مڑنے کا اندیشہ تھا۔

''پلیز میری مدد کرو!'' وہ شستہ انگریزی میں بولی۔

میں چند سیکنڈ کے لیے ہچکچایا، پھر ہاتھ اوپر اٹھا کر میں نے اس کی اسمارٹ کمر پر اپنی گرفت مضبوط کی اور تھوڑا سا اچھال کر اسے نیچے گودام میں اتار لیا۔ اترتے ہوئے اس کا پاؤں کسی چیز پر پڑا، وہ ذرا سا ڈگمگائی اور سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے بازوؤں میں آ گئی۔ اس کے نرم بال میرے چہرے پر پھیلے اور جسم کی خوشبو میرے حواسوں پر چھاتی چلی گئی۔ یہ محسوس کر کے میرے دل میں شادیانے بج گئے کہ سلویا نے میرے بازوؤں سے

نکلنے کی فوری کوشش نہیں کی۔ یہ بڑا امید افزا اشارہ تھا۔ میں نے اسے کچھ اور بھی اپنے قریب سمیٹ لیا۔ اس نے ذرا سا چونک کر میری جانب دیکھا۔ نیم تیرگی میں اس کے چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ چمکی اور ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا۔ کتنا بڑا فاصلہ تھا جو ہم نے لمحوں میں طے کر لیا تھا۔ موافق لمحے کبھی کبھی ایسے ہی خواہشوں کی پذیرائی کیا کرتے ہیں۔

جہاں ہم تھے، وہاں کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی آتا بھی تو ہمیں فوری طور پر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ سلویا کے لمس نے مجھے ہیجانی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ میں نے اس کے بالوں کو چوما پھر میرے ہونٹ اس کی پیشانی پر اور پیشانی سے نیچے تک پھسلتے چلے گئے۔ وہ بھی جیسے سپردگی کی ادا بن گئی۔ ہم نے ابھی تک اظہارِ محبت نہیں کیا تھا لیکن اتنی قربت کے بعد اظہارِ محبت کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی تھی۔

دفعتاً ایک آواز نے ہمیں بری طرح ٹھٹکا دیا۔ یہ گودام کا دروازہ کھلنے کی آواز تھی پھر بابے صادق کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''پتر اسلم! چھوٹا چوہدری ادھر آ رہا ہے۔''

بابے کی آواز میں موجود سراسیمگی نے مجھے دہلا دیا۔ میں نے سلویا کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''عالمگیر ادھر آ رہا ہے۔ تم نکل جاؤ۔''

میں نے ایک بار پھر اس کی کمر کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اسے اوپر اٹھا اور کھڑکی کی دہلیز پر چڑھا دیا۔ وہ سبک بدن تیزی سے کھڑکی میں اوجھل ہو گئی۔ میں نے پٹ بند کر دیے اور بھوسے کی اوٹ میں ہو گیا۔ عالمگیر کی آواز دروازے کے بالکل قریب سنائی دے رہی تھی، پھر وہ اندر آ گیا۔ میری دھڑکنیں پریشانی کے سبب درہم برہم ہونے لگیں۔ عالمگیر نے ڈیزل کے ڈرموں کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر تک کھٹ پٹ کرتا رہا پھر باہر نکل گیا۔ عالمگیر کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد، بابے صادق کے اشارے پر میں بھی گودام سے نکلا اور گاؤں کی تاریک گلیوں میں چلتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

شوکت بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے شروع سے آخری تک سبھی کچھ اسے بتا دیا۔ صرف ان حسین لمحوں کے بارے میں نہیں بتایا جو گودام کی نیم تیرگی میں میسر

نصیب بنے تھے۔ بہرحال شوکت بھی پولیس والا تھا، وہ مجھے مسلسل کھوجی نظروں سے دیکھ رہا تھا...... اور چبھتے ہوئے سوال پوچھ رہا تھا۔ یہ سوال ہم دونوں کو بے حد پریشان کر رہا تھا کہ سلویا مجھ سے کیا اہم بات کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اپنے اوپر تھوڑا سا غصہ بھی آ رہا تھا۔ میں سلویا کے قرب میں اس بری طرح کھو گیا کہ کوئی اور بات کر ہی نہیں سکا۔ ہم دونوں قریباً ایک منٹ سے زائد وقت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے لیکن ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔ بہرحال جو ہوا وہ بھی کچھ کم اہم نہیں تھا۔ وہ ناقابل فراموش لمحے جو روح میں بس گئے تھے اور امر ہو گئے تھے۔ میں انہیں سوچتا تو لگتا تھا کہ جاگتی آنکھوں سے کوئی سنہرا خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس گاؤں میں آتے ہوئے میرے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں شاید کسی الھڑ مٹیار کا تصور موجود ہو۔ میں نے یہ سوچا ہو کہ گاؤں کی کسی خوب رو لڑکی سے ملاقات ہو گی۔ آنکھوں میں باتیں ہوں گی اور کسی کہانی کا آغاز ہو گا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا، یہ میں نے ہرگز نہیں سوچا تھا۔ کہاں گاؤں اور کہاں لندن کی خوب رو حسینہ...... اور کہاں ایک سہمی سہمی سی فضا میں پروان چڑھتا ہوا محبت کا پودا۔

☆=====☆=====☆

باغ پور کی وہ رات بھی اپنے دامن میں خوف اور غیر یقینی کیفیت لیے ہوئے تھی۔ بے شک عجیب الخلقت گرفتار ہو گیا تھا اور اس کی گرفتاری کے چرچے دور و نزدیک پھیل گئے تھے پھر بھی علاقے کے باسیوں کے ذہن خوف سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ ہر چہرہ اب بھی خوف کی علامت تھا اور اب بھی ہر آنکھ میں خوف منجمد دکھائی دیتا تھا۔ عجیب الخلقت کے بارے میں اَن گنت سوال اٹھ رہے تھے۔ اس حوالے سے خوفناک باتیں گھڑی جا رہی تھیں۔ حوالدار فدا حسین جیسے بے شمار لوگ اب بھی اس بات پر مُصر تھے کہ یہ بدارواح اور آسیب کا چکر ہے۔ آج سارا دن لوگ دور دور سے اس عجیب الوضع قاتل کو دیکھنے کے لیے آتے رہے تھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری تھا۔ بہرحال ابھی کچھ دیر پہلے شوکت نے تماشائیوں کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ ایسے لوگ کو نہ صرف تھانے میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا بلکہ دوسرے دیہات سے آنے والوں کو گاؤں سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ جاتے جاتے ڈی ایس پی صاحب ہدایت کر گئے تھے کہ ''ملزم'' سے فی الوقت کسی بھی طرح کی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ نہ ہی کوئی ایسا کام کیا جائے جس کے سبب اس کے مشتعل ہونے کا اندیشہ ہو۔

اگلے روز دوپہر کے وقت گاؤں کی سوگوار فضا کچھ اور بھی سوگوار نظر آنے لگی۔ ایک رات کے بدنصیب دولہا کمپاؤنڈر رحمت کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد گاؤں واپس پہنچ گئی تھی۔ رحمت کی موت سے ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ظہر کے بعد شادی والے گھر سے رحمت کا جنازہ اٹھا تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اگر قاتل، پولیس کی تحویل میں نہ ہوتا تو غم زدہ لوگ اس کی دھجیاں اڑا دیتے۔

شام چار بجے کے قریب بابا صادق پھر مجھ سے ملا۔ اس نے چپکے سے اطلاع دی۔

''میم جی نے آج پھر پیغام دیا ہے۔''

''کیا کہتی ہیں؟''

''وہ کہتی ہے کہ کل والی جگہ پر آج پھر آئے گی، لیکن آج سات بجے کا ٹائم ہے......''

''ٹھیک ہے...... میں آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

بابا اپنے پوپلے منہ میں زبان گھما کر بولا۔ ''پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کل تو پتا نہیں چھوٹا چوہدری کیسے آ گیا۔ ورنہ شام کے بعد کوئی اس طرف کم ہی آتا ہے۔'' ایک دو باتیں کرنے کے بعد بابا صادق چلا گیا۔

شام ٹھیک سات بجے میں ایک بار پھر گودام میں موجود تھا۔ کل کے خوشبودار لمحے ابھی تک دماغ میں چکرا رہے تھے، لیکن آج میں سب سے پہلے سلویا سے کام کی بات کرنا چاہتا تھا۔ جونہی گھڑی کی سوئیاں سات کے ہندسے پر پہنچیں، میں کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ وقت کی پابندی کے سلسلے میں انگریز مشہور ہیں۔ کل بھی سلویا عین وقت پر آ گئی تھی۔ میں کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ سات کے بعد سوا سات بجے...... ساڑھے سات بجے، پھر آٹھ کا وقت ہو گیا لیکن وہ نہیں آئی۔ میری بے چینی عروج پر تھی جب گودام کے دروازے پر بابے صادق کی شکل نظر آئی۔ اس نے مایوس کن لہجے میں کہا۔ ''اسلم پتر! آج میم جی نہیں آئے گی۔''

''کیوں...... کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دونوں صاحب، میم جی کے پاس بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ذرا دیر کے لیے کمرے سے باہر آئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں، وہ آج نہیں آ سکتی ہے۔''

''پھر اب کیا کیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑے پریشان لگ رہے ہو۔'' جہاں دیدہ بابے صادق نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔ پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتی ہے؟''

''ہاں...... پتا نہیں......'' بابے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ انداز میں ہلکی سی شوخی بھی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بابے صادق نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چلو...... کل تک اور انتظار کرلو...... ویسے...... میرا ایک خیال اور بھی ہے۔'' بابے نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کیسا خیال؟''

''شاید میم اور تینوں صاحب...... ایک دو دن میں یہاں سے جانے کی تیاری کررہے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ...... واپس لاہور چلے جائیں گے۔''

''شاید...... ایسا ہی ہو...... لیکن ایک بات کا مجھے پکا پتا ہے۔ وہ جانے سے پہلے ایک واری تم سے ملے گی ضرور۔'' بابے کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک بار پھر دبی دبی شوخی چمک گئی۔

میں گھر واپس پہنچا تو شوکت تھانے گیا ہوا تھا۔ مالک مکان چاند سے معلوم ہوا کہ تھانے میں ملزم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کافی اوراُدھم مچایا تھا۔ وہ کچھ بھی کھا پی نہیں رہا۔ شوکت صاحب اسی کو دیکھنے گئے ہیں۔

سردی آج بھی کڑاکے کی تھی۔ تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ صحن میں نیم اور دھریک کے درخت جھوم رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ اس ڈر کی پرچھائیاں ہیں جو گاؤں کی گلیوں میں رینگ رہا ہے اور درودیوار پر سرسرا رہا ہے۔ میں مسہری پر لیٹ گیا اور ایک بار پھر سلویا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ فرنگن تھی لیکن ان فرنگیوں سے کتنی مختلف تھی جو عرصۂ دراز تک متحدہ ہندوستان پر ظلم ڈھاتے رہے تھے اور سفاکی سے مسکراتے رہے تھے۔ اسے چند دن پہلے دیکھا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ برسوں سے اسے جانتا ہوں، اس کا بولنا، اس کا مسکرانا۔ اس کا شرمانا سب کچھ میرے دیس کی لڑکیوں جیسا ہی تھا۔ کہتے ہیں کہ نمک کی کان میں ہر شے نمک ہو جاتی ہے لیکن وہ تو فرنگیوں کے ملک میں رہتے ہوئے اور نسلاً فرنگی ہوتے ہوئے بھی فرنگی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ تنہائی میں مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟ یہ سوال ایک بار پھر ہتھوڑے کی طرح میرے سر پر برسنے لگا۔ پچانوے فی صد امکان اس بات کا تھا کہ سلویا اس خطرناک قاتل کے بارے میں ہی کچھ کہنا چاہتی ہے جو پچھلے قریباً 36 گھنٹوں سے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ کچھ بول رہا ہے، نہ کچھ بتا رہا ہے...... اور نہ ہی شاید کچھ کھا پی رہا ہے۔

شوکت رات بارہ ایک بجے کے قریب تھانے سے واپس آیا، اس وقت تک میں سو چکا تھا۔ صبح سویرے اطلاع آئی کہ قریبی دیہہ جاگوال کے چوہدری کے گھر چوری ہوگئی ہے۔ کافی روپیا اور زیور گیا تھا۔ چوہدری سے شوکت کے قریبی تعلقات بھی تھے۔ شوکت ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا، پھر بھی اسے جاگوال جانا پڑا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے بھی اپنی کھٹارا جیپ میں سوار کرلیا۔ جاگوال میں ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے میں قریباً تین گھنٹے لگ گئے۔ چوری کی اس اہم واردات کے باوجود جاگوال گاؤں میں بھی عجیب الخلقت قاتل کی باتیں ہی ہو رہی تھیں۔ توہم پرست لوگ نئے نئے شوشے چھوڑ رہے تھے۔ اسے قربِ قیامت کی نشانی قرار دیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ سرگودھا سے اخبار بھی لے آئے تھے۔ اخبار میں عجیب الخلقت شخص کی خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔

ہم جاگوال سے فارغ ہو کر دوپہر بارہ بجے کے قریب واپس باغ پور پہنچے۔ باغ پور میں ایک اور سنسنی خیز خبر ہماری منتظر تھی۔ ابھی ہم باغ پور سے باہر ہی تھے کہ سفید کپڑوں والے ایک پولیس ملازم نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری جیپ کو روکا اور یہ دھماکا خیز اطلاع دی کہ خونی شخص حوالات سے فرار ہوگیا ہے۔ چند لمحوں کے لیے تو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ شوکت کا رنگ بھی ہلدی ہوگیا تھا۔ بتانے والے نے بتایا کہ خونی کے فرار کا واقعہ رات کو کسی وقت ہوا ہے اور اس کا پتا صبح آٹھ بجے کے قریب لگا ہے۔ دراصل میں اور شوکت بہت سویرے باغ پور سے نکل گئے تھے اس لیے اس سانحے کی اطلاع ہمیں اب مل رہی تھی۔

ہم بھاگم بھاگ تھانے پہنچے۔ یہاں سارا عملہ موجود تھا۔ ہر شخص کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اے ایس آئی نیاز...... شوکت تک اطلاع پہنچانے کے لیے جاگوال گیا ہوا تھا لیکن راستے میں اس سے ہماری ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ شوکت کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں،

لگتا تھا کہ مجرم کے فرار سے جہاں شوکت کو شدید صدمہ پہنچا ہے وہاں متوقع تادیبی کارروائی بھی اسے ہراساں کر رہی ہے۔

کل رات تھانے سے واپس آنے سے پہلے شوکت نے ملزم کی حفاظت کی ذمے داری حوالدار رب نواز اور حوالدار مبارک کو سونپی تھی۔ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی ان کے ساتھ تھا۔انہیں پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔شوکت اپنے دونوں حوالداروں یعنی رب نواز اور مبارک علی پر برس پڑا۔وہ دونوں گم صم کھڑے تھے۔ان کے چہرے اندیشوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔اے ایس آئی نذیر کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بھاری نفری کے ساتھ مفرور خونی کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔شوکت نے موقع کا معائنہ کیا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ رسیوں سے جکڑا ہونے کے باوجود قاتل نے رات پچھلے پہر حوالات کی عقبی کھڑکی توڑی اور تھانے کی حدود سے باہر نکل گیا۔یہ کھڑکی حوالات کے کچے فرش سے قریباً تین فٹ بلند تھی۔چھوٹی سی کھڑکی تھی اور اندر لوہے کی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔کم از کم چار سلاخیں کاٹے بغیر بندہ اس کھڑکی سے باہر نہیں نکل سکتا تھا......اور جس شخص سے ہمارا واسطہ پڑا ہوا تھا اس کا تو سر ہی بہت بڑا تھا۔میرے اندازے کے مطابق جب تک ساری سلاخیں نہ کاٹی جاتیں وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا لیکن چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ مفرور نے سلاخوں کو چھیڑا ہی نہیں تھا۔اس نے پوری چوکھٹ ہی اکھاڑ دی تھی۔ جیسا کہ بعد میں شوکت کی زبانی معلوم ہوا۔اس چوکھٹ کے اکھاڑے جانے میں شوکت اور اس کے ساتھیوں کی کوتاہی کو دخل تھا۔کھڑکی کی سلاخیں بہت مضبوط تھیں لیکن خود ''کھڑکی'' مضبوط نہیں تھی۔یہ کھڑکی لاک اپ کی دیوار میں ہلتی تھی۔(شاید ماضی میں کسی حوالاتی نے اس کھڑکی کے ساتھ ناکام قسمت آزمائی کی تھی) شوکت کو پتا تھا کہ کھڑکی ہلتی ہے۔وہ اسے ٹھیک کرانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن پھر پتا نہیں کیسے یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی۔بعض اوقات کوئی غلطی ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے اور احساس دلانے کے بعد دم سادھ لیتی ہے پھر یہ غلطی مہینوں اور سالوں تک اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہمیں اس کی قیمت چکانا پڑتی ہے۔

جب ہم کھڑکی کا جائزہ لے رہے تھے، میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ مجھے

شک گزرا کہ کھڑکی اندر سے نہیں باہر سے اکھاڑی گئی ہے۔یہ بڑا سنسنی خیز قسم کا شک تھا۔ کھڑکی کی چوکھٹ نکل جانے سے اوپر کی کچھ اینٹیں اکھڑ گئی تھیں۔دونوں طرف کی کچھ اینٹیں بھی کھسکی ہوئی دکھائی دیتی تھیں مگر ان ساری کھسکی ہوئی اینٹوں کا رخ اندر کی طرف تھا۔فرق معمولی سا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر پتا چل جاتا تھا۔میری اور شوکت کی نگاہیں ملیں۔شوکت کی نگاہوں نے مجھے بتادیا کہ وہ بھی اس فرق کو نوٹ کر چکا ہے۔

اب تک اے ایس آئی نذیر نے جو تفتیش کی تھی اس کا خلاصہ حوالدار فدا حسین نے ہمیں سنایا۔نذیر نے ملزم کے فرار کے حوالے سے یہ قیافہ قائم کیا تھا کہ ملزم نے کسی طرح اپنے دانتوں سے کاٹ کر یا دیوار وغیرہ سے رگڑ کر اپنی بندشیں کمزور کیں اور پھر توڑ دیں۔ بندشیں توڑنے کے بعد وہ بیت الخلا میں گیا۔یہ چھوٹا سا بیت الخلا حوالات کے اندر ہی موجود تھا۔وہاں سے اس نے ایک اینٹ اٹھائی اور اس کی متواتر ضربوں سے کھڑکی کی چوکھٹ کو باہر کی طرف نکال دیا۔رب نواز کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ شراب کا نشہ کرتا ہے۔رات آخری پہر لاک اپ کے سامنے اسی کی ڈیوٹی تھی۔ممکن تھا کہ اس نے شراب پی رکھی ہو اور ہیڈ کانسٹیبل کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا ہو۔جب وہ نشے میں دھت پڑے ہوں مفرور نے کام دکھا دیا ہو۔

یہ تو تھا اے ایس آئی نذیر کی تفتیش کا نتیجہ......لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم دونوں نے جو ''تفتیش'' کی تھی اس نے اس سارے واقعے کا رنگ ڈھنگ ہی بدل دیا تھا۔ہماری تفتیش یہ تھی کہ کھڑکی اندر سے نہیں باہر سے اکھاڑی گئی ہے۔شوکت نے اس بارے میں کچھ مزید چھان بین کی۔پیشہ ورانہ انداز میں زمینی شہادتوں کو دیکھا۔اسی دوران میں شوکت کا ہوشیار اے ایس آئی نذیر بھی مفرور کی تلاش میں بیکار بھاگ دوڑ کر کے واپس آ گیا۔شوکت نے نذیر کو بھی کھڑکی کی اکھڑی ہوئی اینٹیں دکھائیں اور اپنے مضبوط شبہے کے بارے میں بتایا۔دونوں میں کچھ دیر تک اس بارے میں تبادلۂ خیال ہوا۔شوکت نے اے ایس آئی نذیر سے کہا کہ وہ حوالدار رب نواز کو بلائے۔نذیر حوالدار کو آوازیں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔کچھ دیر بعد نذیر واپس آیا تو اس کے چہرے پر اندیشوں کے گہرے سائے منڈلا رہے تھے۔اس نے بتایا کہ حوالدار شاید تھانے سے باہر گیا ہوا ہے۔شوکت گرج کر بولا۔

"کہاں دفع ہو گیا ہے۔ ڈھونڈ کر لاؤ اس خبیث کو!"

پتا نہیں کیوں مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حوالدار مبارک علی نے آ کر بتایا کہ حوالدار رب نواز کہیں نہیں مل رہا۔ اس کے علاوہ ہیڈ کانسٹیبل شاہنواز کا بھی کہیں پتا نہیں۔

یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ فضا میں سنسنی کی لہریں محسوس ہوئیں۔

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "شوکت! مجھے لگتا ہے کہ حوالدار رب نواز نے ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری اور نذیر کی باتیں سن لی ہیں۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو...... وہ بھاگ نکلا ہے۔"

یہ صورتِ حال ہر شخص کے لیے دھماکا خیز تھی۔ رب نواز کو ڈھونڈنے کے لیے اہلکار چاروں طرف دوڑے۔ شوکت سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حالات بڑا ڈرامائی رخ اختیار کر گئے تھے۔ ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ حوالدار رب نواز اور ہیڈ کانسٹیبل شاہنواز ڈوگر نے قاتل کے فرار ہونے میں کردار ادا کیا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ نوے فی صد امکان اس بات کا تھا کہ ان پولیس ملازمین کو کسی نے بھاری بھرکم رشوت دے کر خریدا ہے۔ یہ خریدار کون ہے؟ کون ہیں؟ انہوں نے رب نواز اور ہیڈ کانسٹیبل شاہنواز ڈوگر کو کس طرح استعمال کیا ہے...... اور قاتل کی رہائی سے انہیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ یہ سارے سوال...... جواب طلب تھے۔ اب تک جو اندازے قائم کیے گئے تھے۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ فرار کا واقعہ رات تین چار بجے کے قریب ہوا ہے۔ اس واقعے کا علم صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوا تھا۔ یعنی ملزم کو فرار ہونے کے لیے اور کسی محفوظ جگہ تک پہنچنے کے لیے چار پانچ گھنٹے ملے تھے۔ یہ بہت زیادہ ٹائم تھا۔ ہاں حوالدار رب نواز اور کانسٹیبل ڈوگر ابھی تازہ دم فرار ہوئے تھے۔ انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ شوکت نے فوری طور پر اے ایس آئی نذیر اور نیاز کو نفری دے کر ان دونوں کی تلاش میں بھیج دیا، اس کے ساتھ ساتھ گاؤں کے گردونواح میں قاتل کی تلاش بھی شروع کر دی گئی۔

عام لوگوں میں دبی دبی افواہیں گردش کر رہی تھیں لیکن ابھی تک انہیں ٹھیک سے

معلوم نہیں تھا کہ کتنا سنگین واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ قاتل کی گرفتاری کے بعد ان بے چارے لوگوں نے کئی روز کے بعد سکھ کا سانس لیا تھا۔ اب ایک بار پھر ان کا سکون بری طرح درہم برہم ہونے والا تھا۔

میں دیر تک سوچتا رہا۔ ذہن بار بار چوہدری کے انگریز مہمانوں کی طرف جا رہا تھا پھر ایک دم میرا دھیان سلویا کی طرف چلا گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ صرف اسی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈال کر مجھ سے ملی تھی لیکن اتفاقاً ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہو سکی، ایک نئے خیال کے تحت میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وقت تیزی کے ساتھ ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ اب مزید احتیاط نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے شوکت سے کہا۔ "چلو آؤ میرے ساتھ......!"

"کہاں؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"چوہدری ارباب کی حویلی میں...... میرا خیال ہے کہ سلویا ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن اپنے ساتھیوں کی وجہ سے ڈر رہی ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"شکاری رازی جان کی موت کی وجہ سے جیکب اور اس کے ساتھی دباؤ میں ہیں۔ اگر ان سے پوچھ گچھ کرنا چاہو گے تو وہ تعاون کریں گے۔ تم ان سے اپنے طریقے کے مطابق علیحدہ علیحدہ پوچھ تاچھ کرو۔ ممکن ہے کہ ہم سلویا سے بھی علیحدگی میں بات کر سکیں گے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے ہم سے...... ہمیں اسے کہنے کا موقع دینا چاہیے۔"

"لیکن اگر تحصیل دار کی دُم پر پاؤں آ گیا تو پھر؟"

"یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے شوکت۔ بڑے بڑے افسروں کے کان کھڑے ہو چکے ہیں۔ گونج سرگودھا اور لاہور تک جا رہی ہے۔ تحصیل دار کہاں تک ٹانگ اڑائے گا۔"

شوکت کے چہرے پر نیم رضامندی کے آثار نظر آنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم چوہدری ارباب کی حویلی کی طرف جا رہے تھے۔

پھاٹک پر چوہدری کے پرانے ملازم بخشو سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک بڑے بل

ڈاگ کی زنجیر تھامے ہوئے تھا۔ یہ کتا میں نے اکثر اس شخص کے ساتھ دیکھا تھا۔

شوکت نے پوچھا۔ ''چوہدری صاحب کہاں ہیں؟''

وہ بولا۔ ''کسی کام سے گئے ہیں جی۔ شام تک آئیں گے شاید......''

''اور عالمگیر؟''

''ان کا مجھے پتا نہیں جی۔''

''چوہدری کے انگریز مہمان کہاں ہیں؟'' شوکت نے بخشو سے پوچھا۔

بخشو کے جواب نے ہمیں جھنجھوڑ دیا۔ وہ بولا۔ ''وہ لوگ تو چلے گئے ہیں جناب!''

میں اور شوکت تعجب سے بخشو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''کب گئے وہ؟'' شوکت نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''وہ تو صبح سات بجے ہی نکل گئے تھے۔'' بخشو کا جواب تھا۔

دال میں جو کالا نظر آ رہا تھا، وہ بالکل نمایاں ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ چوہدری کے مہمانوں کا یوں اچانک چلے جانا اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گیا تھا۔ میری نگاہوں میں ایک بار پھر سلویا کا چہرہ گھوم گیا۔ دل میں ٹیس سی اٹھی۔ یوں لگا کہ ایک دم ہی میرے اردگرد ویرانی پھیل گئی ہے۔ کیا میں پھر اسے دیکھ سکوں گا؟ یہ سوال بڑی شدت سے ذہن میں ابھرا۔

اتنے میں دروازے پر بابا صادق نظر آیا۔ وہ مجھے اور شوکت کو دیکھ کر بولا۔

''آ جاؤ، بچو! اندر آ جاؤ۔''

ہم بھی کسی ایسی ہی پیشکش کا انتظار کر رہے تھے۔ شوکت نے فوراً اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ کتا بردار ملازم بخشو کے چہرے پر ناگواری کی شکن ابھر کر غائب ہو گئی۔ ہم اندر نشست گاہ میں پہنچ گئے۔ یہی جگہ تھی جہاں چند روز قبل ہم نے شراب و شباب کی محفل سجی ہوئی دیکھی تھی۔ اب یہاں مکمل سکوت تھا۔ اردگرد کوئی ملازم بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ فقط بخشو اور اس کا کتا ہمیں ناراض نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے بابے صادق سے پوچھا۔ ''سلویا اور اس کے دوست چلے گئے؟''

بابے نے دل گرفتہ انداز میں سر ہلایا۔ لگتا تھا کہ سلویا کے جانے سے

میری طرح بابا صادق بھی اداس ہو گیا ہے۔ وہ سلویا سے بڑا بے تکلف تھا۔ وہ بھی اسے بے تکلفی سے مخاطب کرتی تھی اور اولڈ سویٹ مین کے خطاب سے نوازتی تھی۔ بابا صادق سلویا کی گلابی اردو کے بس چند ایک لفظ ہی سمجھ پاتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں ''عورت'' کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ سلویا کے ساتھ بابے کے لگاؤ میں شفقت کا عنصر نمایاں تھا۔

بابے سے باتیں کرتے ہوئے اچانک میرا دھیان چند روز پہلے کے واقعات کی طرف چلا گیا۔ ہم اسی چھت تلے بیٹھے تھے جب چھت پر سے کھٹ پھٹ کی آوازیں آئی تھیں اور پھر عالمگیر پریشانی کے عالم میں باہر چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے جس رات چاند زخمی ہوا تھا اس رات بھی شوکت کو حویلی کی چھت پر سے کسی عورت کی آہ و بکا سنائی دی تھی۔ وہ دونوں واقعات ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھے۔ بابا صادق پانی کا گلاس لینے کے لیے باہر گیا تو میں نے سرگوشی کے انداز میں شوکت سے کہا۔ ''آج حویلی میں کوئی نہیں۔ میرے خیال میں حویلی کی چھت دیکھنے کا یہ اچھا موقع ہے۔''

شوکت نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ بابا صادق پانی لے کر واپس آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''بابا! آج تمہاری تھوڑی سی مدد چاہیے۔''

''میں حاضر ہوں پُتر!''

''ہم حویلی کی چھت دیکھنا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

بابے صادق کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''پر پتر جی! چوہدری صاحب نے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔''

''اسی لیے تو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

بابا سوچ میں گم ہو گیا۔ بابا بے شک چوہدری کے ملازموں میں بہت پرانا تھا لیکن مجھے کئی بار اندازہ ہوا تھا کہ وہ چوہدریوں سے اب خوش نہیں ہے۔ خاص طور سے چھوٹے چوہدری عالمگیر سے تو اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ بابے صادق کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ چھوٹے چوہدری کے اللّلے تللّے اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ جب میں نے چھت پر

جانے کی بات کی تو بابے صادق کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک موہوم سی چمک نظر آئی۔ جیسے ہمارے ساتھ ساتھ وہ بھی حویلی کی چھت کے اسرار کو جاننے کی خواہش رکھتا ہو۔

شوکت نے کہا۔ ''ہم بس تھوڑی دیر کے لیے اوپر جائیں گے۔ اس دوران تم آس پاس نظر رکھنا۔''

بابے صادق نے ایک بار پھر ہراساں لہجے میں کہا۔ ''چوہدری صاحب اس معاملے میں بڑے سخت ہیں۔ انہوں نے پکی پکی تاکید کی ہوئی ہے کہ کوئی نوکر سیڑھیاں نہیں چڑھے گا۔''

''یہ پابندی کتنے دن سے لگی ہوئی ہے۔''

''یہی کوئی تین چار ہفتوں سے جی۔''

یہ اتفاق سے بڑا اچھا موقع ہمیں ملا تھا۔ اردگرد کے سارے کمرے خالی نظر آ رہے تھے۔ صرف لال آنکھوں والا بخشو اپنے کتے کے ساتھ برآمدے میں کھڑا تھا۔ شوکت نے کہا۔ ''ایسا کرتے ہیں کہ میں برآمدے میں جا کر اس حرامی بخشو کو باتوں میں لگاتا ہوں اس دوران تم اوپر کا چکر لگا آؤ۔ اگر مجھے کوئی خطرہ نظر آیا تو میں بابے صادق کو آواز دوں گا، تم سمجھ جانا اور نیچے آ جانا۔'' دراصل اپنے زخمی بازو کی وجہ سے شوکت خود اوپر نہیں جانا چاہتا تھا۔

دو تین منٹ کے اندر ہم نے ضروری باتیں طے کر لیں۔ بابا صادق خاموش تھا اس کے چہرے پر نیم رضامندی کے آثار تھے۔

شوکت برآمدے میں چلا گیا تو میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ میں ہر صورت اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اوپر کی منزل پر ایک تنگ راہداری تھی۔ دونوں طرف کوئی دس بارہ کمرے تھے۔ لکڑی کے موٹے دروازوں پر نقش نگار بنے ہوئے تھے اور ان پر سبز رنگ کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ چوہدری ان کمروں کو مہمان خانے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ایک دو دروازوں کے باہر پڑی استعمال شدہ اشیا کو دیکھ کر میں نے قیافہ لگایا کہ انگریز مہمان بھی ان ہی کمروں میں قیام پذیر

تھے۔ (اب وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھے۔ دوسری طرف حوالات سے بونی قاتل بھی پُراسرار طور پر فرار ہو چکا تھا۔ ان دونوں واقعات میں کوئی نادیدہ تعلق محسوس ہوتا تھا) نیم تاریک راہداری سے گزر کر میں ایک قدیم طرز کے بھاری بھرکم دروازے کے سامنے پہنچا۔ دروازے کے ہینڈل لوہے کے تھے ان ہینڈلوں میں ایک زنجیر ڈال کر بڑے سائز کے ایک تالے سے منسلک کر دی گئی تھی۔ میں نے قیافہ لگایا کہ چند روز پہلے چھت پر سے جو آہٹیں سنائی دی تھیں وہ اس دروازے کی دوسری جانب سے آئی تھیں۔ خوش قسمتی سے مجھے راہداری کے ایک گوشے میں کاٹھ کباڑ کے اندر لوہے کا ایک راڈ پڑا ہوا مل گیا۔ میں نے اس راڈ کی مدد سے زنجیر کے ساتھ تھوڑی سی زور آزمائی کی اور دروازہ کھول لیا۔ تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی تھی، یہ آواز کسی ملازم کو حویلی کے اس حصے میں کھینچ سکتی تھی۔ احتیاط کے طور پر میں نے کچھ دیر سن گن لی پھر دروازے میں داخل ہو گیا۔ چند قدم آگے مجھے ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی گئی تھی۔ تاہم، دروازے کے سامنے پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ جس کمرے کا دروازہ ہے، وہ کمرا خالی نہیں ہے۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔ اندر سے کسی کے رونے کی مدھم آواز ابھری...... وہاں کوئی رو رہا تھا۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی، درد میں ڈوبی ہوئی اور سسکیوں میں پروئی ہوئی۔ اس ویرانی میں وہ کس کو سنا رہی تھی اپنا رونا؟ شاید اپنے آپ کو یا صرف اپنے پیدا کرنے والے کو۔ میں نے انگلی کی پشت سے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے ایک عورت کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

''پولیس۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کون!'' عورت نے بے پناہ حیرت سے اپنا سوال دہرایا۔ اس کی آواز میں اضطراب کی بلند لہریں تھیں۔

''پولیس...... پولیس......'' میں نے زور دے کر کہا۔

اچانک اندر سے کوئی دروازے پر جھپٹا اور بڑی شدت سے دروازہ پیٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ ایک فریادی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''خدا کے لیے میری مدد کرو۔ میں یہاں بند

ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے یہاں سے نکالو۔ خدا کے واسطے......'' یہ اسی عورت کی آواز تھی۔ وہ بے طرح چیخ رہی تھی۔ ''تمہیں خدا کا واسطہ...... خدا رسول کا واسطہ......''

''دو منٹ صبر کرو!'' میں نے عورت کو تسلی دی اور پھر تیزی سے واپس سیڑھیوں تک پہنچا۔ یہاں بابا صادق نشست گاہ میں موجود تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ انسپکٹر شوکت کو بلائے۔ چند سیکنڈ بعد شوکت چہرے پر سوالیہ نشان سجائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں شوکت کو لے کر بالائی منزل پر آ گیا۔ بند دروازے تک پہنچتے پہنچتے، میں نے ساری بات اسے بتا دی تھی۔ شوکت نے اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا۔ ایک تنگ کمرے مین ایک ادھیڑ عمر عورت ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ عورت کے کھچڑی بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر میلا کچیلا دیہاتی لباس تھا۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ اس نے شوکت کی وردی دیکھی اور چیخ کر اس سے لپٹ گئی۔

''مجھے یہاں سے لے چلو صاحب جی۔'' وہ گڑگڑائی۔ اس کی آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا اور زرد رخساروں پر آنسو گر رہے تھے۔ شوکت نے تسلی آمیز انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگائے نیم تاریک کمرے سے باہر نکل آیا۔

ابھی ہم راہداری میں ہی تھے کہ سرخ آنکھوں والا بخشو اپنے ایک مسلح ساتھی کے ہمراہ نمودار ہوا۔ ہمارے ساتھ عمر رسیدہ عورت کو دیکھ کر اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ چند لمحے شدید تذبذب میں کھڑا رہا، پھر ہکلا کر بولا۔ ''تھانے دار جی۔ اس دھوکے باز کو کہاں لے جا رہے ہیں آپ؟''

''تھانے لے جا رہا ہوں۔'' شوکت نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن...... چوہدری صاحب کی اجازت کے بغیر......''

''ہاں اس کی اجازت کے بغیر......'' شوکت کا لہجہ مستحکم تھا۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ اب چوہدریوں کی سائیڈ مزید نہیں لی جا سکتی۔

''ہم چوہدری صاحب کے نوکر ہیں جناب...... اور ہماری مجبوری......''

''تمہاری مجبوری کی ایسی کی تیسی...... پیچھے ہٹو ورنہ ابھی ساری بدمعاشی ناک کے راستے نکال دوں گا۔'' شوکت بپھر گیا تھا۔

''جناب ہم نوکر ہیں، لیکن......''

''لیکن...... کیا کرو گے، گولی چلاؤ گے مجھ پر۔ چلاؤ گولی!'' شوکت دہاڑا اور ریوالور نکال لیا۔

چند سیکنڈ شدید ترین تناؤ میں گزرے۔ بخشو کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ پولیس سے مقابلہ کرے یا ہمارے سامنے سے ہٹ جائے۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ چوہدری کی غیر موجودگی میں کوئی بڑا رسک لے سکے۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا، میں اور شوکت خستہ حال عورت کو لیے نیچے آئے اور پھر حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

☆=====☆=====☆

عورت ہمارے سامنے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں نہیں پورا وجود رو رہا ہو۔ اس کے ہاتھ اور ایک رخسار پر چند دن پرانی چوٹوں کے نشان تھے۔ وہ خوف زدہ تھی اور گاہے گاہے چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی تھی، جیسے اسے ڈر ہو کہ اسے حویلی میں قید کرنے والے اس کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچ جائیں گے۔

ہم نے اسے گرم دودھ پلایا اور تسلی تشفی دے کر اس قابل بنایا کہ وہ کچھ بول سکے۔ عورت نے روتے سسکتے ہوئے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ کچھ اس طرح تھا۔

اس نے بتایا کہ اس کا نام زینب ہے۔ وہ ضلع سیالکوٹ کی تحصیل پسرور کی رہنے والی ہے۔ وہ ''میو'' برادری سے تعلق رکھتی ہے (میوات کے رہنے والے یہ مسلمان راجپوت، پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں عموماً دیکھنے میں آتے ہیں۔ کئی مقامات پر ان کے پورے پورے گاؤں آباد ہیں۔ ان کی وضع قطع اور لب ولہجہ مقامی پنجابیوں سے خاصا مختلف ہوتا ہے۔ یہ سانولی رنگت کے لوگ بولی میں زیادہ تر اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں) زینب نامی اس عورت نے بتایا کہ وہ اپنے گمشدہ بچے کو ڈھونڈتی ہوئی اس گاؤں تک پہنچی ہے۔

شوکت نے عورت سے بچے کے بارے مین پوچھا۔ عورت کے جواب نے ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہمیں یقین نہیں ہوا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے، لیکن وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس کے ذہن سے ''ماں کی زبان'' بول رہی تھی...... اور ماں کبھی جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ عورت نے

کہا۔ ''تھانے دار جی...... میرا بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہے۔ اس میں پیدائش کے وقت سے کچھ نقص ہیں۔ لوگ اسے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں...... پر وہ برا نہیں ہے جی۔ اس کا نام صابو ہے......''

شوکت نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔ میں نے کہا۔ ''تم کسی بچے کی بات کر رہی ہو یا جوان بندے کی۔''

''وہ جوان ہے، لیکن میرے لیے تو بچہ ہی ہے جی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ابھی میری گود سے نکل کر کہیں چلا گیا ہے۔'' عورت عجیب درمندی سے بولی۔ اس کے لہجے نے ہمیں ہلا دیا۔

یہ بات اب تقریباً واضح ہو گئی تھی کہ عورت اسی عجیب الخلقت کا ذکر کر رہی ہے جس نے قرب و جوار میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ میں اور شوکت حیرت سے اس دکھیاری عورت کی طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد جھریاں نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے بے حد میلے سویٹر میں سے اس کی کمزور کلائیاں جھانک رہی تھیں۔

''کب کھویا تھا تمہارا بیٹا؟'' شوکت نے پوچھا۔

''زیادہ دن نہیں ہوئے جی...... پر مجھے تو لگتا ہے کہ کئی زمانے گزر گئے......''

میں نے کہا۔ ''ماں جی! بہتر ہے کہ آپ شروع سے ساری بات بتائیں اور سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ آپ کہاں کی رہنے والی ہیں......؟''

کچھ دیر بعد عورت نے اپنی روئداد اس طرح شروع کی۔ میں گجرات سے بیاہ کر یہاں پسرور میں آئی تھی۔ میرے گاؤں کا نام کھوہ والی ہے لیکن اس سے پہلے میں رنگ پور نام کے گاؤں میں اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ آج سے کوئی بیس سال پہلے میں نے ایک بچے کو پیدا کیا۔ دیکھنے والوں نے کہا یہ بڑا بدصورت اور خوفناک ہے۔ کسی نے کہا یہ کسی بددعا کا نتیجہ ہے۔ کوئی ظالم بولا کہ اس میں شیطان کی روح ہے...... لیکن سرکار! یہ کچھ نہیں تھا۔ وہ صرف ایک بچہ تھا۔ دوسرے بچوں کی طرح معصوم اور بے گناہ...... شروع شروع میں وہ مجھے عجیب ضرور لگتا تھا۔ خاص طور سے اس کا بہت بڑا سر اور اس کی ٹیڑھی

آنکھیں دیکھ کر میرا دل بجھ جاتا تھا لیکن جب اس نے میرا دودھ پی لیا۔ میری گود میں کھیل لیا اور میرے ساتھ لپٹ کر سو لیا، تو وہ مجھے اسی طرح اچھا لگنے لگا جس طرح ہر ماں کو اپنا بچہ اچھا لگتا ہے۔ لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے تھے۔ اس کے بارے میں دل دکھانے والی باتیں کرتے تھے، میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اپنے بچے کو چادر میں چھپایا اور رنگ پور گاؤں سے لے کر دور نکل گئی۔ میرا خاوند میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے بھی میرے ساتھ آنا پڑا۔ رنگ پور سے پندرہ بیس کوس دور ہم کھوہ والی گاؤں سے گزر رہے تھے جب وہاں کے نمبردار چوہدری نے ہمیں دیکھ لیا۔ نمبردار چوہدری بڑا خدا ترس بندہ تھا، اس نے ہماری مجبوری کو سمجھ لیا اور ہم پر مہربانی کی۔ اس نے گاؤں سے دور ایک الگ تھلگ مکان ہمیں رہنے کے لیے دے دیا۔ وہاں نمبردار چوہدری کا باغ تھا۔ ہم میاں بیوی باغ کی دیکھ بھال کرنے لگے اور وہیں پر رہنے لگے۔ شاید آپ کو میری بات پر یقین نہ آئے صاحب جی...... لیکن میں وہی کچھ بتا رہی ہوں جو حقیقت ہے۔ میں اور میرا خاوند اس باغ میں اٹھارہ سال تک رہے لیکن ان اٹھارہ سالوں میں چوہدری اس کی بیوی اور ایک بھائی کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ میں صابو کو ہر آنکھ سے بچا کر رکھتی تھی۔ وہ کبھی گھر کی چار دیواری سے نکلا ہی نہیں۔ اگر کبھی رات کے وقت وہ باغ میں آتا بھی تھا تو میں سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ میرے بچے کو دیکھ کر لوگ ڈر جاتے ہیں۔ ایک دفعہ رات کے وقت تین پردیسی راہگیروں نے اسے دیکھ لیا۔ ان میں سے ایک عورت تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ اس کے ساتھی مرد اسے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر لے گئے اور اتنے خوف زدہ ہوئے کہ اپنا کچھ سامان بھی چھوڑ گئے۔ اس واقعے کے بعد میں اور میرا خاوند صابو کے بارے میں اور بھی احتیاط کرنے لگے تھے۔ صابو کے بعد میرا کوئی بچہ نہیں ہوا۔ میرے لیے وہی سب کچھ تھا اور اب بھی وہی سب کچھ ہے......'' عورت نے دکھی لہجے میں کہا اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

ہم دونوں بے حد تعجب سے ایک ماں کی انوکھی کہانی سن رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک اپنے خیالات جمع کرتی رہی پھر بولی۔ ''نمبردار چوہدری کے باغ میں ایک عمر بیت گئی۔

کچھ عرصہ پہلے میرا خاوند بھی مر گیا۔ اب بس میں تھی اور میرا صابو تھا۔ نمبردار چوہدری اب بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کا ایک بھتیجا رستم بڑا تیز طرار اور کرخت نکلا۔ وہ اپنے یاروں کے ساتھ اکثر سیر اور شکار کے لیے باغ میں آتا تھا۔ یہ کوئی ایک مہینا پہلے کی بات ہے، رستم باغ میں آیا۔ اس کے ساتھ تین چار گورے بھی تھے۔ ہم ماں بیٹا باغ کے بیچوں بیچ ایک کچے مکان میں رہتے تھے۔ مکان کے پچھواڑے ایک کھلا احاطہ ہے۔ اسے ہر طرف سے امرود اور مالٹے کے درختوں نے گھیر رکھا ہے۔ صابو بس اسی احاطے کے اندر رہتا تھا لیکن...... میری بدقسمتی کہ اس دن وہ احاطے سے باہر تھا اور زمین پر گرے پھل اکٹھے کر رہا تھا۔ گوروں (انگریزوں) نے اسے دیکھا اور پھر چھپ کر دیر تک دیکھتے رہے۔ وہ حیران رہ گئے تھے۔ ان بدبختوں کے لیے میرا صابو ایک عجیب جانور کی طرح تھا۔ میں نے گھر کے اندر سے صابو کو دیکھا اور اسے چھپ کر دیکھنے والے گوروں کو بھی دیکھا۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مجھے گوروں کی نظروں میں فتور نظر آیا تھا۔ میں باہر نکلی اور اپنے بچے کو لے کر جلدی سے گھر میں آ گئی۔ میرا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس وقت تو کچھ نہیں ہوا سرکار پر ٹھیک دو روز بعد وہ ظالم میرا بچہ مجھ سے چھین کر لے گئے۔ ان ظالموں کو ایک روتی چیختی ماں پر ذرا ترس نہیں آیا۔ میرا کلیجا نوچا اور اندھیرے میں گم ہو گئے......''
عورت کی آواز بھرا گئی۔ اس کے ہونٹ کانپتے چلے جا رہے تھے، پھر وہ زار زار رونے لگی۔

''حضور! وہ میرا بچہ ہے۔ جیسا بھی ہے میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میری گود میں کھیلا ہے۔ اس نے میری چھاتیوں سے دودھ پیا ہے۔ پر وہ بے رحم...... وہ بے رحم اسے مجھ سے دور لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ اسے سات سمندر پار ولایت لے جائیں گے۔ لوگوں کو اس کا تماشا دکھائیں گے۔ جانوروں کی طرح اس سے کرتب کرائیں گے۔ حضور...... یہ کیسی ناانصافی ہے۔ وہ جیسا بھی ہے لیکن جانور تو نہیں ہے۔ وہ انسان ہے سرکار...... اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اپنی کوکھ کے جنے کی قیمت میں کیسے وصول کر لوں۔ بھلا کوئی ماں اپنی اولاد کی قیمت وصول کر سکتی ہے۔ وہ مجھے روپیا دیتے ہیں۔ سرکار! آپ ہی بتائیں۔ کون اپنا خون بیچ سکتا ہے۔ کون اپنے جگر گوشے کے پیسے کھرے کر سکتا ہے۔ سرکار! کون

کر سکتا ہے ایسا؟''
زینب نامی وہ عورت آنسوؤں میں بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے ہمارے چہرے تک رہی تھی۔ ہمارے اعصاب سُن تھے، ہمارے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شاید کسی مرد کے پاس ایسے سوالوں کا جامع جواب نہیں ہو سکتا۔ یہ ماں کے سوالات تھے اور ان کا جواب کوئی ماں ہی دے سکتی تھی۔ وہ ماں جو اس وقت بھی بچے کو پیار کرتی ہے جب وہ اس کے پیٹ میں ہوتا ہے، جسے وہ اپنے خون سے سینچتی ہے، جو اسے دیکھنے سے پہلے ہی اس کے ساتھ ایک ''عرصہ'' بسر کرتی ہے۔ اس کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے اور جب وہ پیدا ہوتا ہے تو لوگوں کے لیے نومولود ہوتا ہے لیکن ماں کے لیے اس کی عمر نو ماہ ہوتی ہے۔

ہم ایک عجیب بچے کی ماں کے روبرو نہیں تھے، ہم صرف ایک ماں کے روبرو تھے، وہ عظیم ہستی جو اپنے سینے میں کائنات کا سب سے طاقت ور جذبہ لے کر پھرتی ہے...... اور اں چلا رہی تھی۔ ''حضور! میرے بچے کی جان بچائیں۔ وہ ظالم اسے سات سندر پار لے جائیں گے، میں اس کی صورت کو ترس جاؤں گی، میں جیتے جی مر جاؤں گی حضور...... اس کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں...... اور نہ میرے سوا اس کا کوئی دنیا میں ہے...... ہم دونوں مر جائیں گے سرکار...... ہم دونوں مر جائیں گے۔''
ہم ششدر تھے۔ ہماری سماعت ماؤف ہو رہی تھی۔ وہ کریہہ الصورت شخص جسے دیکھ کر لوگوں کی گھگھی بندھتی تھی، ایک ماں کا لاڈلا بیٹا تھا، اس کی ممتا بھری آنکھوں کا چاند تھا۔ وہ اپنے جگر گوشے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر روتی بلکتی فریاد تھی اور یہ فریاد ہماری آنکھوں کو بھی نم کر رہی تھی۔ میرے دل کی گہرائیوں سے صدا آئی......

اسلم! یہ ایک عورت نہیں۔ یہ ایک مقدس رشتہ ہے جو تیرے سامنے موجود ہے۔ آنسوؤں میں بھیگا ہوا اور فطری جذبوں میں گندھا ہوا۔ اسے تیری مدد درکار ہے اور اس کی مدد کرنا ہر اس شخص پر فرض ہے جس نے کسی عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس خوب صورت ماں کے کمزور شانے پر ہاتھ رکھا اور ہولے

سے کہا۔ ''ماں جی! آپ حوصلے اور صبر سے تفصیل کے ساتھ مکمل بات بتائیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم سے جو کچھ ہو سکا آپ کے لیے کریں گے۔''

عورت نے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ماں نے امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ایک بار پھر آہوں اور سسکیوں کے درمیان اپنی بپتا بیان کرنا شروع کر دی۔ عورت کی گفتگو خاصی طویل تھی۔ اس گفتگو سے ہم نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ انگریز (یعنی جیکب اور اس کے ساتھی) کسی خاص مقصد کے لیے عورت کے عجیب الخلقت بیٹے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے نمبردار چوہدری کے بھتیجے رستم کے ساتھ مل کر زینب اور اس کے بیٹے صابر پر شب خون مارا اور صابو کو اٹھا کر لے گئے لیکن پھر یوں ہوا کہ عجیب الخلقت صابو نے راستے میں خود کو چھڑا لیا۔ اس نے اپنی غیر معمولی ''جسمانی طاقت'' کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک گورے کو زخمی کیا اور ان کی حراست سے نکل بھاگا۔ گورے صابو کا کھوج لگاتے ہوئے باغ پور آ پہنچے۔ اسی اثناء میں صابو کی ماں بھی صابو کے لیے در بدر بھٹکتی اور ٹھوکریں کھاتی باغ پور پہنچ گئی۔ باغ پور پہنچنے کے بعد گورے یعنی جیکب وغیرہ چوہدری ارباب کے یہاں مہمان ٹھہرے۔ کیونکہ ان کا تعلق تحصیل دار فیروز علی ٹوانہ سے تھا۔ چوہدری ارباب کی حویلی میں قیام کے دوران ہی جیکب اور ہارڈی نے زینب کو دیکھ لیا۔ وہ نیم دیوانوں کی طرح گاؤں کی گلیوں میں گھوم رہی تھی۔ جیکب نے خطرہ محسوس کیا اور چھوٹے چوہدری عالمگیر کی مدد سے زینب کو اٹھوا کر حویلی کی بالائی منزل پر پہنچا دیا۔ رات کے وقت یہ کام اتنی رازداری سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ حویلی کے ملازمین میں سے بھی بس دو تین کو ہی اصل صورتِ حال کا علم تھا۔ حویلی کے ''قید خانے'' میں دکھیاری زینب اکثر واویلا کرتی رہتی تھی اور اپنے صابو کو پکارتی تھی۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے شاید چوہدری اس کے ناتواں جسم کو زندگی کی قید سے آزاد ہی کر دیتے لیکن ایک اور بات بھی ان کے ذہن میں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید کسی مرحلے میں وحشی صابو کو قابو کرنے کے لیے اس کی ماں کی ضرورت پڑ جائے یا یہ عورت کسی اور طریقے سے ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ابھی تک زندہ رکھے ہوئے تھے۔

ہم نے جو تجزیہ کیا تھا اگر وہ درست تھا اور وہ سب کچھ بھی درست تھا جو صابو کی ماں زینب بیان کر چکی تھی تو پھر حالات ایک خاص رخ کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ صابو کو حوالات سے نکالنے والے چوہدری ارباب اور اس کے انگریز مہمان ہی تھے یا یوں کہہ لیں کہ چوہدری ارباب نے یہ کام اپنے انگریز مہمانوں کے لیے کروایا تھا اور اب صابو ان کی تحویل میں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ لوگ صابو کو لے کر یہاں سے اڑن چھو ہونے والے ہوں۔ ان کی منزل کوئی بھی ہو سکتی تھی۔ سرگودھا...... لاہور یا پھر لاہور سے آگے کہیں اور...... حالات سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ لوگ عجیب الخلقت صابو کو لندن لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے تھے، جیکب اور ہارڈی کا تعلق لندن کی ایک مشہور سرکس کمپنی سے تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ لوگ صابو کو سرکس کے حوالے سے ہی لندن پہنچانا چاہتے ہوں۔

میں نے کہا۔ ''یار شوکت! لگتا ہے کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ بابے صادق کے مطابق جیکب وغیرہ کو یہاں سے روانہ ہوئے آٹھ گھنٹے ہو چکے ہیں۔''

''اگر واقعی صابو ان کے پاس ہے تو وہ کافی دور نکل چکے ہوں گے۔'' شوکت نے پُرسوچ انداز میں میری تائید کی۔

''پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''میرا خیال ہے کہ بخشو...... چوہدری کا خاص کارندہ ہے۔ اسے دس بیس چھتر لگاتے ہیں۔ وہ بتائے گا کہ سب لوگ کدھر گئے ہیں۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی شوکت نے اے ایس آئی نذیر کو حویلی کی طرف دوڑا دیا۔

زینب ہماری طرف مسلسل فریادی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہم سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ اس کے باوجود اسے شبہ ہو چکا تھا کہ ہم اس کے بیٹے کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ بار بار ہمارے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی اور التجا کرنے لگی کہ ہم اسے اس کے صابو کی شکل دکھا دیں۔

شوکت نے کہا۔ ''ماں جی! وہ ہمارے پاس ہوتا تو ہم ایک منٹ سے پہلے اسے

آپ کے سامنے لے آتے۔ جس طرح آپ اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہیں ہم بھی ڈھونڈ رہے ہیں......''

وہ کراہی۔ ''تو پھر جلدی کرو میرے پترو...... پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میرے بغیر اس نمانے کا کیا حال ہوتا ہے۔ وہ بچوں کی طرح رونے لگتا ہے۔ وہ بہت رویا ہوگا۔ پتا نہیں وہ کچھ کھاتا بھی ہوگا کہ نہیں۔ وہ تو کسی سے بات بھی نہیں کرسکتا۔ کسی کو اپنی ضرورت بھی نہیں بتا سکتا...... ہائے میں کیا کروں۔''

اسی دوران میں اے ایس آئی نذیر واپس آ گیا۔ وہ بخشو یا اس کے بھائی کے بجائے ایک اور کارندے کو پکڑ لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ بخشو وغیرہ حویلی میں موجود نہیں ہیں۔ وہ حالات کے تیور دیکھ کر دائیں بائیں ہو گئے تھے) جس کارندے کو نذیر پکڑ کر لایا تھا وہ حالات سے بے خبر معلوم ہوتا تھا پھر بھی شوکت نے اسے تھوڑی سی مار لگوائی۔ وہ چیخنے چلانے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکا۔

ہم نے فوراً ملزمان کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ شوکت نے صابو کی ماں کو اپنے ماتحتوں کی کڑی حفاظت میں دیا اور خود اے ایس آئی نذیر اور ایک کانسٹیبل کو لے کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں بھی ساتھ جانے پر کمربستہ تھا۔ شوکت کی کھٹارا جیپ خراب پڑی تھی۔ اس نے گھوڑے منگوائے اور ہم باغ پور سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت دن کے قریباً تین بجے تھے۔ سردیوں کی زرد دھوپ ٹھٹھری ہوئی اور خوف زدہ نظر آتی تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں سناٹے کا راج تھا۔ دروازے بند تھے۔ جو چند لوگ یہاں وہاں نظر آئے ان کی آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا۔ اے ایس آئی نذیر نے بتایا کہ ''قاتل'' کے فرار کی خبر ہر خاص و عام تک پہنچ چکی ہے۔

عجیب صورتِ حال تھی۔ جو حیوان نما شخص لوگوں کے لیے قاتل اور درندہ تھا، وہ ایک ماں کے لیے اس کا معصوم بیٹا تھا۔ اب پتا نہیں کہ خلق خدا صحیح تھی...... یا ایک ماں کا مؤقف درست تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ بڑے سے بڑا مجرم بھی اپنی ماں کے لیے معصوم اور بے گناہ ہی ہوتا ہے۔ عجیب الخلقت صابو نے بھی بے دردی سے قتل کیے تھے اور اس پر ایک نوبیاہتا لڑکی پر مجرمانہ حملے کا الزام بھی تھا۔ اس کی سفاکی دیکھی جاتی تو اس کے لیے

رحم کی کوئی رمق دل میں پیدا نہیں ہوتی تھی لیکن کوئی ایسی بات تھی جو مجھے دوسری طرح سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ میری نگاہوں میں گاہے گاہے ہانکے کا منظر گھوم جاتا تھا۔ عجیب الخلقت یعنی صابو کو پکڑنے کے بعد جب اس پر لاٹھیاں برسائی جارہی تھیں اور میں اس کا لہولہان چہرہ دیکھ رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں جھانک کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ مجھے یہی لگا تھا جیسے میں ایک بہت طاقت ور لیکن بہت ڈرے سہمے ہوئے جانور کی آنکھوں میں جھانک رہا ہوں۔ ان لمحوں میں اس خونی قاتل کے حوالے سے میرا سارا خوف زائل ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

ہم گھوڑے دوڑاتے ہوئے گاؤں کی حدود سے باہر نکلے۔ ٹوٹیوں والے کھوہ کے پاس کچے راستے سے گزرتے ہوئے میری نگاہ گنے کے اس وسیع کھیت پر پڑی جہاں سلویا سے میری اوّلین ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بابے صادق سے ڈر کر بھاگی تھی اور مجھے اپنا ساتھی سمجھ کر محبت سے لپٹ گئی تھی۔ جسموں کا وہ پہلا ملاپ...... وہ پہلا لمس...... جو ذہن پر اَن مٹ نقش چھوڑ گیا تھا۔ مجھے اس کی اونی جرسی سے اٹھنے والی خوشبو اور اس کی ملائمت تک یاد تھی۔ جب میں سلویا کو یاد کرتا تھا تو اس کی جرسی کا لمس بھی اسی طرح یاد آتا تھا جس طرح اس کا اپنا لمس یاد آتا تھا۔ وہ اب کہاں تھی؟ کیا سوچ رہی تھی؟ وہ مجھ سے الوداعی ملاقات بھی نہیں کرسکی تھی۔ یقیناً اس کے دل میں بھی وہ کانٹا موجود ہوگا جو میرے دل میں لمحہ لمحہ کھٹک رہا تھا۔ میں سوچتا رہا اور خالی خالی نظروں سے قرب وجوار کو دیکھتا رہا۔

کہنے کو تو شوکت گاؤں سے نکل آیا تھا لیکن اس کے ذہن میں کوئی واضح پروگرام نہیں تھا کہ جیکب اور چوہدری وغیرہ کی تلاش میں کدھر جانا ہے۔ ایک خیال یہ تھا کہ ڈیک نالا پار کر کے شہر کا رخ کیا جائے، دوسرا خیال تحصیل دار فیروز علی کی طرف جانے کا تھا۔ انگریزوں کی اصل یاری تو تحصیل دار کے ساتھ ہی تھی لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا جیکب وغیرہ تحصیل دار کی طرف جانے کا رسک لے سکتے ہیں۔ یہ بات انہیں بھی معلوم تھی کہ پولیس ان کی تلاش میں سب سے پہلے تحصیل دار کے گھر کا رخ کرے گی۔

اچانک مجھے گاڑی کے ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ اس سے پہلے ہم کئی مرتبہ یہ نشانات گاؤں کی گلیوں میں دیکھ چکے تھے۔ یقیناً یہ اسی سرخ کار کے نشانات تھے جو آج

کل جیکب وغیرہ کے استعمال میں تھی۔ نشانات تازہ تھے۔ ہماری امید بندھ گئی۔ ہم نے
ان نشانات کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ ہمارا رخ ڈیک نالے کی طرف ہی تھا۔ ہم
نے اندازاً تین چار فرلانگ تک اسی طرح سفر کیا پھر ہم جھاڑیوں سے اٹی ہوئی گھاس والی
زمین پر پہنچ گئے۔ یہاں آ کر گاڑی کے نشانات دوسرے نشانوں میں گڈمڈ ہو گئے۔ دو بیل
گاڑیوں کے نشان تھے۔ اس کے علاوہ بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ بھی یہاں گھومتا رہا تھا۔
کھوجی باپ بیٹا ہمارے ساتھ ہوتے تو شاید ہم کچھ مزید آگے بڑھ سکتے لیکن ہمارے لیے
یہاں آ کر معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا انگریز شکاریوں اور ان کے ''شکار'' کے ملنے کی امید کم
ہو رہی تھی۔ ذہن ان لوگوں کی عیاری پر کھول رہا تھا۔ وہ کتنی ہوشیاری کے ساتھ ہماری
ناک کے عین نیچے اپنے کام میں مصروف رہے تھے۔ تیسری دنیا کے انسانوں کو یہ لوگ
انسان سمجھتے ہی کب ہیں اور صابو نام کا وہ ''عجیب الخلقت'' تو ویسے ہی حیوان نما تھا۔ وہ ان
کے لیے فقط ایک دلچسپ تماشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہت بڑے سر اور چار بازوؤں والا
ایک انوکھا تماشا۔ وہ اسے اس کی زمین سے جدا کر کے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے.....
اور ایک ماں تڑپ رہی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ صابو کو مشتعل کر کے خون ریزی پر آمادہ
کرنے میں ان گورے شکاریوں کا ہی ہاتھ ہو۔ بہرحال ابھی اس بارے میں یقین سے
کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اچانک اے ایس آئی نذیر نے ایک طرف اشارہ کیا اور حیرانی سے کہا۔ ''وہ
دیکھیں سر!''

میں اور شوکت ایک ساتھ گھومے، ہمیں ایک حیران کن منظر دکھائی دیا۔ ایک مدت
گزر جانے کے باوجود وہ منظر مجھے آج تک یاد ہے۔ جیسے آج کل ٹی وی کے اشتہاروں
میں لڑکیاں بال کھولے کھیتوں میں بھاگتی نظر آتی ہیں، اسی طرح ایک لڑکی بڑی رفتار سے
ہماری طرف دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں اور شوکت یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ سلویا تھی۔
اس کے شہد رنگ بال ڈوبتے سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ وہ اسی جرسی میں تھی
جس کا لمس دن رات میرے تصور میں سمایا رہتا تھا۔ جرسی کے ساتھ ہی اس کا پُرشباب جسم

بھی ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی اور اپنی باریک آواز میں
کچھ کہہ رہی تھی۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اکا دکا کھیت مزدور اٹھ اٹھ کر اسے دیکھ
رہے تھے۔ چند کتے دور دور ہی سے شور مچا رہے تھے۔

شوکت نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ یہاں کیسے؟''

ہم نے گھوڑے کھیتوں کی طرف موڑ دیے۔ چند ہی لمحے بعد ہانپتی کانپتی سلویا
ہمارے سامنے تھی۔ اس کے گال شہابی ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی
نگاہیں ملیں۔ ایک برق سی ہمارے درمیان کوند گئی۔ یہ برق صرف ہم دونوں نے دیکھی اور
ہم دونوں نے ہی محسوس کی۔

ہم گھوڑوں سے اتر کر سلویا کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے پتلون پہن رکھی تھی اور نیچے
فل بوٹ تھے جو گھاس اور کیچڑ سے اٹے ہوئے تھے۔ پتا نہیں وہ کہاں سے پگڈنڈیوں پر
اور کھیتوں میں بھاگتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔ وہ گھٹنے زمین پر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا
سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور گردن جھکا کر اپنا سانس درست کرنے کی کوشش کرنے
لگی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے سر اٹھایا اور بال جھٹک کر گلابی اردو میں بولی۔ ''مسٹر انسپکٹر اور
مسٹر آسلم! ہام آپ دونوں کو اپنے ساتھ لے جانا مانگتا۔ ادھر حوالاتی (صابو) کا لائف
سخت خطرے میں ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟'' شوکت نے پوچھا۔

''بس آپ سوال جواب میں ٹائم ضائع نائیں کریں۔ ایک دم کے ساتھ آئیں۔''
اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اپنے عقب میں گھوڑے پر سوار کر لیا۔
یہ نازک موقع تھا ورنہ شوکت میری طرف مسکراتی نظروں سے ضرور دیکھتا۔

''ادھر جانا ہے۔'' سلویا نے اس طرف اشارہ کیا جدھر سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

میں نے انگریزی میں کہا۔ ''سلویا! تھوڑی سی وضاحت کرو۔ ہمیں کہاں لے جا
رہی ہو۔''

''ادھر تھوڑی ہی دور ''کھوہ والی'' گاؤں ہے۔ صابو وہاں ہے۔ جیکب ہارڈی اور
چوہدری ارباب وغیرہ سب وہیں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر خطرہ زیادہ ہے تو ہم مزید نفری منگوا سکتے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''خطرہ تو ہے لیکن اب وقت نہیں ہے۔ وہاں کسی بھی وقت صابو کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

وہ جس طرح صابو کا نام لے رہی تھی، اندازہ ہوتا تھا کہ وہ صابو کو دیر سے جانتی ہے۔ تناؤ کے سبب سلویا کا سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''سلویا! تم نے کہا تھا کہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہو۔ کیا بات تھی وہ؟''

''یہی بات تھی آسلم! میں تمہیں بتانا چاہتی تھی۔ صابو اتنا بڑا گنہگار نہیں جتنا تم لوگ اسے سمجھ رہے ہو۔ اس کو ستایا گیا ہے، اس پر جبر کیا گیا ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔'' میں نے شوکت کے پیچھے پیچھے گھوڑا دوڑاتے ہوئے کہا۔

''یہ پچھلی باتیں سمجھانے کا وقت نہیں ہے آسلم! ابھی تم آگے کے بارے میں سوچو۔ صابو اس وقت نمبردار کی حویلی میں ہے۔ نمبردار کا بھتیجا روستم (رستم) بھی وہیں ہے۔ چوہدری ارباب اور چھوٹا چوہدری عالمگیر بھی وہیں ہے۔''

''کیا ارادہ ہے ان لوگوں کا؟''

''ارادہ اچھا نہیں ہے۔ یہ لوگ صابو کو لاہور لے جانا چاہتے ہیں۔ وہاں سے اسے لندن پہنچانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''Freak Shows کے لیے۔'' سلویا نے جواب دیا۔

''Freak Shows...... یہ کیا بلا ہے؟''

''اس کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ فوری مسئلہ یہ ہے کہ صابو بڑی مصیبت میں ہے۔ جیکب اور ہارڈی اس پر زبردست تشدد کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسے اتنا خوف زدہ کر دیں کہ سفر کے دوران میں وہ بے چون و چرا...... ان کی ہدایات پر

عمل کرے۔ وہ اسے ایک خاص قسم کے نشے کے انجکشن بھی لگانا چاہتے ہیں۔ یہ نشہ اعصاب پر اثر کرتا ہے۔ بندہ بیداری کی حالت میں ہوتا ہے لیکن اپنے جسم کو اپنی مرضی سے حرکت نہیں دے سکتا۔ اس نشہ آور دوا کی ذرا سی اضافی ڈوز ذہن کو ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ صابو جیسے شخص کو یہ دوا انجیکٹ کر دی گئی تو وہ بالکل دیوانہ ہو جائے گا۔'' سلویا کا لب و لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، سچ ہے اور اس میں کسی بھی طرح کی چال بازی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

جب ہم ''کھوہ والی'' کی حدود میں داخل ہوئے شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہم چاروں گھوڑے دوڑاتے ہوئے سیدھے نمبردار کی حویلی کے دروازے پر پہنچے۔ یہ بڑا فلمی سا منظر تھا لیکن اس منظر کی سنگینی اور حدت صرف ہم ہی محسوس کر سکتے تھے۔

سلویا میرے عقب میں گھوڑے پر موجود تھی اور اس کا میرے عقب میں موجود ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں اور خصوصاً ہارڈی سے کھلم کھلا بغاوت کر چکی ہے (میں جانتا تھا کہ ہارڈی کے ساتھ سلویا کی چپقلش اندر ہی اندر پروان چڑھ رہی ہے، اب یہ کھل کر سامنے آ گئی تھی)۔

شوکت اور نذیر وغیرہ وردی میں تھے۔ ان کے کہنے پر حویلی کے ملازم کو دروازہ کھولنا پڑا۔ گھوڑوں سے اتر کر ہم اندر داخل ہوئے۔ گھنی مونچھوں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ایک جواں سال شخص باہر نکلا۔ وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔ اے ایس آئی نذیر نے سرگوشی میں کہا ''یہی نمبردار کا بھتیجا رستم ہے۔''

رستم نے میرے ساتھ سلویا کو دیکھا اور کچھ مزید گھبرایا ہوا دکھائی دینے لگا۔ اس کے ری ایکشن سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حویلی میں سلویا کی غیر موجودگی سے بے خبر تھا۔

شوکت نے تھانے داری لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''چوہدری ارباب اور دوسرے لوگ کہاں ہیں؟''

رستم ہکلا کر بولا۔ ''شوکت صاب...... وہ...... لوگ تھوڑی دیر پہلے یہاں سے چلے گئے ہیں۔''

سلویا بے دھڑک چلا کر بولی۔ ''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہام کی کار وہ کھڑی ہے، دیوار

کے پیچھے۔''

میں نے دیکھا، سلویا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سرخ کار کو ایک برآمدے میں چھپانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس کا کچھ حصہ دیوار کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ شوکت نے پلک جھپکتے میں اپنا سرکاری ریوالور نکال لیا۔ اے ایس آئی نذیر نے بھی تقلید کی۔ دو ریوالوروں کی جھلک دیکھ کر رستم سخت خوف زدہ نظر آنے لگا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''آپ پتا نہیں کیا سمجھ رہے ہو تھانے دار صاحب!''

یہی وقت تھا جب میری نگاہ چھت کی طرف اٹھ گئی۔ ایک بندوق کی نالی منڈیر سے جھانک رہی تھی۔ میں نے پہلو میں کھڑے شوکت کو ٹھوکا دیا اور بندوق کے بارے میں بتایا۔ شوکت کے چہرے پر سرخی سی لہرا گئی اور وہ پہلے سے زیادہ چوکس نظر آنے لگا۔ یہی وقت تھا جب پہلا فائر ہوا۔ گولی سلویا کے سر کے قریب سے ہوتی ہوئی عقبی دیوار میں پیوست ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ دوسری گولی چلتی، شوکت نے تاک کر جوابی فائر کیا ایک دھماکے سے شعلہ لپکا اور رائفل کے عقب میں نظر آنے والا سر جھٹکے سے پیچھے گیا۔ سیڑھیوں سے ایک شخص لڑھکتا ہوا دھڑام سے نیچے آن گرا۔ یہ چوہدری ارباب کا بیٹا یعنی چھوٹا چوہدری عالمگیر تھا۔ گولی اس کے رخسار پر لگی تھی اور وہ جان لیوا طور پر زخمی ہو چکا تھا۔

اچانک سیڑھیوں کی طرف بالائی منزل پر چوہدری ارباب نظر آیا۔ وہ بیٹے کے انجام پر بے حد مشتعل دکھائی دیتا تھا۔ اس کی سفید مونچھیں جیسے طیش کے عالم میں پھڑک رہی تھیں۔ اس نے اپنی تھری ناٹ تھری رائفل سیدھی کی اور ایک بڑھک کے ساتھ مجھ پر فائر کر دیا۔ شعلہ نکلنے سے پہلے ہی میں چھلانگ لگا کر ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ گولی سنسناتی ہوئی میرے آس پاس سے گزری۔

''کوئی کتا بچ کر نہ جائے!'' چوہدری ارباب کی غضب ناک چنگھاڑ سنائی دی۔

ایک دوسری آواز نے پکار کر کہا۔ ''پھاٹک بند کر دو۔'' یہ غالباً رستم کی آواز تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں اور سلویا دو جڑے ہوئے ستونوں کی محفوظ آڑ لینے میں کامیاب رہے تھے۔ اے ایس آئی نذیر بھی ہمارے ساتھ

تھا۔ شوکت اور ہیڈ کانسٹیبل ایک دیوار کی اوٹ میں تھے۔ جونہی اندھا دھند فائرنگ شروع ہوئی نذیر نے اپنے سویٹر کے نیچے سے ایک ریوالور برآمد کیا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کے ساتھ ہی مٹھی بھر گولیاں بھی اس نے میری جیب میں ٹھونس دیں۔ میں بھی بلا تامل اس ''معرکے'' میں شامل ہو گیا۔ حویلی کے اندر ہر طرف شعلے چمکنے لگے اور دھماکوں سے در و دیوار لرزنے لگے۔ گولیاں ''ٹھس ٹھس'' کی بھدی آوازوں کے ساتھ کچی دیواروں میں پیوست ہو رہی تھیں۔

اچانک مجھے کراہ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اے ایس آئی نذیر کی پسلیوں میں گولی لگی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے تاہم وہ اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ اچانک میرے ریوالور سے ٹرچ ٹرچ کی آواز آنے لگی۔ چیمبر خالی ہو چکا تھا۔ میرے متوجہ ہونے سے پہلے ہی سلویا نے میری جیب میں ہاتھ ڈال کر گولیاں نکال لی تھیں۔ اس نے گولیاں میرے ہاتھ میں تھمائیں۔ میں ریوالور ری لوڈ کرنے لگا۔ اس دوران میں زخمی نذیر نے میری جگہ سنبھال لی اور فائرنگ جاری رکھی۔ اچانک ایک عجیب سی دہاڑ سنائی دی۔ یہ دہاڑ کسی اندرونی کمرے سے بلند ہوئی تھی۔ عجیب گونجتی ہوئی سی مہیب آواز تھی۔ میں ایک لمحے میں جان گیا۔ یہ عجیب الخلقت صابو تھا۔ میں نے چند سیکنڈ تک سوچا، پھر حوصلہ جمع کیا، سلویا کو آگاہ کیے بغیر میں ستون کی آڑ سے نکلا اور تیزی سے فائرنگ کرتا ہوا صابو کی طرف دوڑا۔ اب سوچتا ہوں تو تھوڑا سا تعجب بھی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی ہمت سے بڑھ کر کام کیا تھا۔ آٹھ دس گز کا فاصلہ طے کرتے ہوئے میں نے پورا چیمبر خالی کر دیا اور ایک تاریک کمرے میں پہنچ گیا۔ آواز ساتھ والے کمرے سے آ رہی تھی۔ میں نے اس کمرے کا دروازہ کھولا۔ میرے سامنے لالٹین کی روشنی میں صابو رسیوں سے جکڑا کچے فرش پر پڑا تھا۔ اس کے وسیع و عریض جسم پر کھدر کا کھلا سا لبادہ تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا جیبی چاقو نکالا اور تیزی سے صابو کی بندشیں کاٹنا شروع کر دیں۔ چاقو تیز تھا، میں بہت طاقت بھی صرف کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ میں رسیاں کٹ گئیں۔ صابو آزاد تھا لیکن وہ اسی طرح زمین پر لیٹا رہا۔ میں اس کی نفسیاتی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ وہ خوفزدہ تھا...... یا خوفزدہ کر دیا گیا تھا۔ غنیمت تھا کہ ابھی تک ہمارے

مدِ مقابل افراد میں سے کوئی اس کمرے تک نہیں پہنچا تھا...... غالباً تابڑ توڑ فائرنگ نے اس کمرے کو وقتی طور پر محفوظ کر دیا تھا۔

''اٹھو صابو۔'' میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔

وہ بس خالی خالی سفید آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے خون آلود ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔ آنکھوں کا درمیانی فاصلہ غیر معمولی تھا۔ مسلسل دھماکوں اور چیخ پکار نے اسے مشتعل کرنے کے بجائے بالکل سہما دیا تھا۔ پھر مجھے لگا کہ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے چاروں بازوؤں میں جنبش ہو رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا سا اٹھ کھڑا ہوا۔

یہی وقت تھا جب برآمدے کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ مجھے شبہ گزرا کہ شوکت اور ہیڈ کانسٹیبل کے پاس ایمونیشن ختم ہو گیا ہے...... یا ہونے والا ہے۔ دوسری طرف میرا ریوالور بھی فی الحال خالی تھا۔ گولیاں موجود تھیں لیکن وہ ریوالور میں نہیں میری جیب میں تھیں۔ بھاگتے قدموں کی آواز قریب آئیں اور پھر میں نے شوکت کو دیکھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی دیوار کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ گولی اس کے 38 بور ریوالور میں پھنس گئی تھی۔ وہ اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے چہرے پر جھلاہٹ تھی۔

''اپنا ریوالور دو۔'' شوکت نے مجھے مخاطب کر کے تیزی سے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا یا کرتا، سلویا کی چیختی ہوئی آواز آئی، پھر وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں گھس آئی۔ سلویا کے عقب میں بپھرا ہوا ہارڈی تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ سلویا بھاگ کر ہمارے عقب میں آ گئی تو ہانپا ہوا ہارڈی رک گیا۔ ہارڈی کے پیچھے ہی پیچھے کم از کم چھ مسلح آدمی تھے۔ دو کے ہاتھ میں برچھیاں تھیں اور باقی چمکتی لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ ان کے پیچھے جنیب اور اسمتھ بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک بار پھر ڈرامائی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ اس وسیع کمرے میں سلویا، صابو، شوکت اور میں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ دوسری طرف چوہدری ارباب اور اس کے ''ہمنوا'' تھے۔ اپنے بیٹے کے خونچکاں جسم کو دیکھنے کے بعد چوہدری ارباب کی آنکھوں میں لہو اتر

آیا تھا۔ وہ شاٹ گن لہرا کر ہارڈی سے بولا۔ ''تم اس لڑکی کے ٹکڑے کرو، میں اس حرامی تھانیدار کی ٹانگیں چیرتا ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ اس چھت کے نیچے ہم سب کی موت کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے چوہدری ارباب کی شاٹ گن شوکت کی طرف اٹھتے دیکھی۔ شوکت جو میرا جگر تھا۔ جس کی محبت لڑکپن سے میرے لہو میں شامل تھی۔ چوہدری کے ہاتھ میں تھمی ہوئی موت شوکت کی طرف اٹھ گئی تھی۔ شوکت کا فاصلہ چوہدری سے زیادہ تھا، جب کہ میرا کم تھا۔ میں چوہدری پر جھپٹ سکتا تھا۔ اس جھپٹ میں تاخیر کا مطلب، موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دو قدم بھاگ کر چھلانگ لگائی اور چوہدری ارباب کے اوپر جا گرا۔ شاٹ گن کی نال میری بغل میں سے ہوتی ہوئی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ چوہدری نے گرتے ہوئے ٹریگر دبایا اور چھروں کی بوچھاڑ چھت کی لکڑی میں گھس گئی۔ میرا اندازہ تھا کہ اب میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ لاٹھی بردار پوری وحشت کے ساتھ مجھ پر جھپٹ پڑیں گے لیکن میرا یہ اندازہ درست ثابت نہیں ہوا۔ میرا سر لاٹھیوں کی جان لیوا کھٹا کھٹ سے محفوظ رہا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا، لاٹھی بردار وہ غلطی کر چکے تھے جس کی میں توقع کر رہا تھا اور یہ ایک سنگین غلطی تھی۔ انہوں نے شہ زور صابو پر حملہ کیا تھا۔ میں جانتا تھا صابو سکتہ زدہ ہے، وہ اس وقت سکتے سے نکلے گا جب اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو گا۔ اس کی جدوجہد اس کو درپیش خطرے سے مشروط تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے چند لاٹھیاں صابو کے سر پر پڑیں...... اس نے پہلے اپنا آپ بچانے کی کوشش کی پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ لاٹھی برداروں پر پل پڑا۔ اس کا انداز انتہائی وحشیانہ تھا۔ میں نے اپنے نیچے دبے ہوئے چوہدری ارباب کی کنپٹی پر اتنی طاقت سے ریوالور کا دستہ مارا کہ اس کے پاس بے ہوش ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ (ایک ہی ضرب سے اس کی آنکھیں الٹ گئیں اور جسم کانپنے لگا تھا) شوکت بڑی دلیری کے ساتھ دو لاٹھی برداروں سے گتھم گتھا تھا۔ ایک لاٹھی بردار کے چہرے پر شوکت کی زوردار ٹکر لگی اور وہ ڈکراتا ہوا کمرے سے باہر جا گرا۔ دوسرے کو شوکت نے گھما کر اس زور سے دیوار کے ساتھ مارا کہ وہ وہیں لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ ایک کونے میں ہارڈی نظر آیا۔ وہ پورے کا پورا سلویا پر سوار تھا اور اسے طمانچے مار

رہا تھا۔ جواباً وہ اس کا چہرہ نوچ رہی تھی۔ شوکت نے عقب سے ہارڈی کو اپنے بازوؤں میں جکڑا اور زمین پر گرا لیا۔

اس دست بہ دست لڑائی کا اہم ترین کردار صابو تھا۔ وہ بالکل ایک مشتعل جانور نظر آ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک فربہ اندام برچھی بردار کا بازو چکنا چور کیا اور ایک کو اٹھا کر برآمدے میں پھینک دیا۔ لگتا تھا کہ چند منٹ کی تابڑ توڑ فائرنگ کے بعد ہمارے حریفوں کے پاس بھی ایمونیشن ختم ہو چکا ہے۔ اگر ان کے پاس ایمونیشن ہوتا تو وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر صابو کو ضرور فائر مارتے۔ صابو کے چار بازوؤں کو جارحانہ طریقے سے حرکت کرتے ہوئے دیکھنا اور اس کی گونجدار آوازوں کو سننا ایک دہشت ناک تجربہ تھا اور یہ دہشت ہمارے حریفوں پر کہیں زیادہ شدت سے اثر کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ پسپا ہو رہے ہیں۔ درحقیقت یہ تصور ہی ان کے حوصلے توڑنے کے لیے کافی تھا کہ باغ پور کا جنونی قاتل آزاد ہو گیا ہے۔

انگریزوں میں سے جیکب سب سے ہوشیار اور دانا بنتا تھا۔ وہ اس دست بہ دست لڑائی میں سب سے آخر میں شامل ہوا لیکن جونہی وہ شامل ہوا صابو کا ایک ایسا جھانپڑ اس کے سرخ رخسار پر پڑا کہ وہ تین قلابازیاں کھا کر کمرے کی دہلیز پر گرا اور اٹھ نہیں سکا۔ معلوم نہیں کہ وہ بے ہوش ہوا تھا یا بے ہوش بن گیا تھا۔ اس کے ایک پاؤں سے جوتی اتر کر کئی فٹ دور جا گری تھی۔ میں نے جیکب کے تیسرے ساتھی اسمتھ کو بڑی بدحواسی کے عالم میں حویلی کی ڈیوڑھی کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اس کی حالت دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ اس کی پتلون خشک نہیں رہی ہو گی۔

صابو کی دہشت نے دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف کر دیا۔ شوکت نے بے ہوش چوہدری ارباب کی شاٹ گن اٹھا لی۔ میں نے بھی پھر سے ریوالور لوڈ کر لیا۔ برآمدے کی دوسری جانب سے اکا دکا فائر ہو رہے تھے۔ اس فائرنگ کا جواب ہیڈ کانسٹیبل دے رہا تھا...... پھر یہ فائرنگ بھی بند ہو گئی۔ ہیڈ کانسٹیبل کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ ''انسپکٹر صاحب باہر آئیں۔ نذیر صاحب کی حالت خراب ہے۔''

ہم چوہدری ارباب اور جیکب کے بے حرکت جسموں کو پھلانگتے ہوئے برآمدے

ں پہنچے۔ جڑے ہوئے ستونوں کے عقب میں اے ایس آئی نذیر لہولہان پڑا تھا...... وکت نذیر کو سنبھالنے لگا۔ میرا دھیان صابو کی طرف چلا گیا۔ وہ کہاں تھا؟ کہیں وہ پھر نکل نہیں بھاگا تھا۔

طویل برآمدے کے آخری سرے سے سلویا چلا کر بولی۔ ''آ سلم! وہ یہاں ہے۔ ں نے اسے بند کر دیا ہے۔''

یہی وقت تھا جب بھاگتے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ باغ پور سے مزید ''پولیس ری'' اسلحے سمیت موقع پر پہنچ گئی تھی۔ پولیس والے سراسیمہ تیزی سے آ رہے تھے۔ یہ ی بروقت کمک تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہم حالات پر قابو پا لیں گے۔

ہارڈی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اسمتھ کی طرح وہ بھی موقع سے نکل بھاگا تھا۔ اس خبیث نے سلویا کو بڑی وحشت سے نوچا کھسوٹا تھا۔ سلویا کے جسم پر میری محبوب جرسی تار تار ہو گئی ی اور گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ شوکت نے ایک گرم چادر اٹھا کر سلویا کو دی تاکہ وہ خود کو ھانپ سکے۔

اندرونی کمرے سے صابو کی دہاڑیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بار بار ندرونی کمرے کے آہنی دروازے پر بھی دو ہتڑ برسا رہا تھا۔ ہر طرف بارود کی تیز بو تھی ر جگہ جگہ گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ اب پریشانی اس بات کی تھی کہ صابو کو قابو لیسے کیا جائے۔ کمرے کا دروازہ بے شک لوہے کا تھا لیکن کھڑکیاں لکڑی کی تھیں اور ان ں باہر کی طرف فقط جالی لگی ہوئی تھی۔ صابو کسی بھی وقت ان رکاوٹوں کو درہم برہم کر سکتا ا۔

پولیس کی تازہ نفری میں اے ایس آئی نیاز بھی شامل تھا۔ اے ایس آئی نذیر سے ں کا گہرا یارانہ تھا۔ نذیر کو جاں بہ لب دیکھ کر وہ باقاعدہ رونے لگا، پھر میں نے دیکھا کہ غم کی شدت سے چور ہو کر زمین پر پڑے ایک جسم کو ٹھوکریں مار رہا ہے۔ لالٹین کی مدھم وشنی میں غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چھوٹے چوہدری عالمگیر کی لاش ہے۔ وہ شوکت کے ر سے سیڑھیوں کے عین سامنے گرا تھا اور وہیں پر ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی از کو بہ مشکل سنبھالا اور اسے عالمگیر کی لاش سے دور لے گیا۔ اے ایس آئی نذیر کی

حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کا بچنا مشکل ہے لیکن اسے یوں جاں کنی کے عالم میں تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ گاؤں میں موجود ایک جیپ کے ذریعے نذیر کو فوراً تحصیل اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ چوہدری ارباب اور اس کے دو کارندے بھی شدید زخمی تھے۔ چوہدری تو خیر بے ہوش تھا لیکن اس کے دونوں کارندوں کی مشکیں اچھی طرح کس دی گئیں اور انہیں بھی نذیر کے ساتھ ہی اسپتال روانہ کیا گیا۔

چوہدری ارباب یوں تو بڑا پھنے خاں بنتا تھا لیکن لڑائی کے دوران میں وہ کنپٹی پر لگنے والی ایک زوردار ضرب برداشت نہیں کر سکا تھا اور مکمل طور پر انٹا غفیل ہو گیا تھا۔ حالتِ بے ہوشی میں اس کا پلپلا جسم مسلسل کانپ رہا تھا۔ بالکل جیسے کوئی جانور ذبح ہونے کے بعد بھی تھرتھراتا رہتا ہے۔ ''شراب و شباب'' کی زیادتی اکثر لوگوں پر ایسے ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ بہ ظاہر ہٹے کٹے نظر آئیں تو بھی اندر سے ''پھوکے'' ہی ہوتے ہیں۔

سات آٹھ منٹ تک جاری رہنے والی اس دھواں دھار لڑائی میں دونوں طرف سے کم و بیش پانچ سو راؤنڈ فائر کیے گئے تھے۔ ایک شخص یعنی عالمگیر لڑائی کے شروع میں ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ رستم کے ایک دوست کو سینے پر دو گولیاں لگی تھیں اور وہ بھی موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ اس کے علاوہ تین افراد شدید زخمی ہوئے تھے۔ (جن میں سے ایک اور اسپتال جاتے جاتے دم توڑ گیا...... یہ ہمارا ہوشیار اور جی دار ساتھی اے ایس آئی نذیر تھا۔ نذیر کی موت کی خبر ہمیں رات دس بجے کے قریب ملی) شام نے گہری سوگوار تاریکی کی چادر اوڑھ لی تھی۔ حویلی کے باہر سینکڑوں لوگ جمع تھے، وہ جاننا چاہتے تھے کہ اندر کیا ہوا ہے...... اور کیا ہو رہا ہے۔ صابو نے بند کمرے کے اندر جو چیخم دھاڑ مچا رکھی تھی اس کی بازگشت حویلی سے باہر تک سنی جا رہی تھی۔ یہ آوازیں ''کھوہ والی'' گاؤں کے باشندوں کے ہراس میں اضافہ کر رہی تھیں۔

حویلی کے کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے دو اور بندے پکڑ لیے گئے۔ شوکت نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ دونوں حرامی ہارڈی اور اسمتھ نکل بھاگے ہیں۔''

''چلو بڑا مجرم تو ہمارے پاس ہے۔'' میری مراد جیکب سے تھی۔

اچانک ایک نئے خیال کے تحت میں چونک گیا۔ جیکب کو صابو کا طوفانی جھانپڑ پڑا

تھا۔ یہ جھانپڑ کھا کر وہ کمرے کی دہلیز پر گرا تھا اور اٹھ نہیں سکا تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا یا بے ہوش بن گیا تھا۔ بہر حال...... اصل مسئلہ یہ تھا کہ جیکب کہاں ہے۔ اگر وہ اسی کمرے میں رہ گیا تھا جس میں سلویا نے صابو کو بند کیا تھا تو پھر یہ بہت خطرناک تھا۔

میں نے سلویا سے پوچھا۔ ''جیکب دروازے کے اندر ہے یا باہر۔''

''کیا مطلب؟''

''تم نے جیکب کو صابو کے ساتھ تو بند نہیں کر دیا۔'' میں نے پوچھا۔

''مم...... مجھے...... ٹھیک سے پتا نہیں۔ وہاں اندھیرا ہو گیا تھا۔'' سلویا ہکلا کر بولی...... اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بھی شدید تشویش میں مبتلا ہو گئی ہے۔

شوکت اپنے ماتحتوں کو اسمتھ اور ہارڈی کی تلاش کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا۔ میں سلویا اور دو رائفل برداروں کو ساتھ لیتا ہوا حویلی کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں مشتعل صابو کو بند کیا گیا تھا۔ آہنی دروازے کے پیچھے اس کی جارحیت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت وہ دروازے کو اکھاڑ کر پھینک دے گا لیکن آہنی دروازے کے آگے ایک دروازہ اور بھی تھا جو سلویا نے احتیاطاً بند کر دیا تھا۔

میں نے یہ دروازہ کھلوایا۔ نیلے رنگ کا آہنی دروازہ ہمیں صاف دکھائی دینے لگا، یہ دروازہ جیسے کسی بھونچال کی زد میں تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی چوکھٹ سمیت اکھڑ کر پہلے کمرے میں آ گرے گا۔ پہلا کمرا خالی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جیکب دوسرے کمرے میں صابو کے ساتھ ہے۔ چند سیکنڈ بعد اس کی تصدیق ہو گئی۔ صابو کی چنگھاڑوں کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک دبی ہوئی آواز بھی آئی۔

سلویا روہانسی آواز میں بولی۔ ''جیکب اندر ہے۔ اب کیا کریں؟''

اتنے میں شوکت بھی پہنچ گیا۔ سلویا کا سفید چہرہ دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''جیکب اندر ہے، وہ مدد کے لیے پکار رہا ہے۔'' سلویا نے کہا۔

''پکارنے دیں اسے...... یہ سارا کیا دھرا اسی کا ہے۔'' شوکت نے پھنکار کر کہا۔

جیکب کی چیختی ہوئی آواز ہم نے صاف سنی۔ ''ہیلپ...... ہیلپ...... بچاؤ۔'' وہ

اردو انگریزی دونوں زبانوں میں دہائی دے رہا تھا۔

آواز کے آہنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے اندر ہی کسی اونچی جگہ پر چڑھ گیا ہے اور خود کو صابو کی مہلک دسترس سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یقیناً یہ جیکب کے لیے نہایت خطرناک صورتِ حال تھی۔ وہ کسی بھی وقت صابو کی وحشت کا شکار ہو سکتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر آہنی دروازہ کھولا جاتا تو صابو کو زخمی کیے بغیر قابو کرنا ممکن نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسے گولی مار کر زخمی کرنا پڑتا۔ وہ بالکل وحشی ہو رہا تھا۔

میں اور شوکت ایک دوجے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ سلویا کی خوبرو پیشانی پر بھی تشویش کی شکنیں تھیں۔ اچانک ایک جاں فزا فقرہ میرے کانوں میں پڑا۔ تازہ نفری کے ساتھ آنے والے مخبر نوازش چاند نے کہا۔ ''ملزم کی ماں بھی ساتھ آئی ہے۔''

اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ صابو کی والدہ زینب بی بی کو بھی ساتھ لائے ہیں۔

''کہاں ہے وہ؟'' شوکت نے بے تابی سے پوچھا۔

''اسے باہر چھوڑ آئے ہیں۔'' حوالدار فدا حسین نے کہا۔ ''ہمیں خبر نہیں تھی جناب، کہ یہاں کے حالات کیسے ہیں۔''

''اسے لے کر آؤ...... جلدی۔'' شوکت نے کہا۔

دو منٹ بعد روتی سسکتی زینب ہمارے روبرو تھی۔ اس نے حویلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنے بیٹے کی پکار سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر ممتا ٹوٹ کر برسنے لگی...... اور صرف چہرہ ہی نہیں اس کا تو پورا جسم ہی ممتا کی پھوار میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ مجھے اور شوکت کو دیکھتے ہی دہائی دینے لگی۔ ''مجھے میرے پتر کے پاس جانے دو...... خدا کے واسطے مجھے اس کے پاس جانے دو۔''

میں نے اسے بہ مشکل دروازے کی طرف بڑھنے سے روکا۔

شوکت بولا۔ ''ماں جی! وہ بپھرا ہوا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ابھی ہم دروازہ نہیں کھول سکتے۔''

''خدا کے لیے دروازہ کھول دو...... وہ مر جائے گا۔ وہ رو رو کر مر جائے گا۔ وہ بھوکا

ہے...... وہ تکلیف میں ہے...... مجھے اس کے پاس جانے دو۔''

اس کی آوازیں شاید اندر موجود صابو تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ دروازے کے ساتھ اس کی زور آزمائی بھی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ وہ ناقابل فہم آوازوں میں اپنی ماں کو پکار رہا تھا...... جیسے ایک چھوٹا سا بچہ...... اپنی ماں کی گود...... اور اس کے دودھ کے لیے ترس رہا ہو۔ کتنا بڑا تضاد تھا یہ...... کیسا معما تھا؟ کہاں ایک سفاک قاتل...... ایک، عزت کا لٹیرا...... کہاں یہ روتا بلکتا وجود...... آہنی دروازے کے عقب سے بلند ہونے والی آوزوں کا کرب میں نے محسوس کیا اور میرے دل نے کہا کہ ہمیں بے جا خوف کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے شوکت کا کاندھا دباتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''شوکت! میرا خیال ہے کہ ہمیں ماں جی کی بات مان لینی چاہیے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ صابو کو سنبھال لیں گی......''

''لیکن اگر نہ سنبھال سکیں تو......'' شوکت کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

''پھر ہم کوشش کریں گے۔''

حوالدار فدا حسین نے گھگھیائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جناب! میں تو کہتا ہوں کہ دروازہ کھولنے سے پہلے سچے سائیں کے کسی پیارے کو بلا لیں۔ ان ہوائی چیزوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس ''خونی'' میں بھی ہوائی چیزوں کا زور آیا ہوا ہے۔''

صابو کی پھنکاروں کے پس منظر میں ایک بار پھر جیکب کی چیختی ہوئی آواز آئی ''بچاؤ...... پلیز مجھے بچاؤ۔''

''شوکت! ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' میں نے پھر شوکت کو ٹہوکا دیا۔

شوکت چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہا، پھر اس نے ریوالور دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''چلو، پھر آگے بڑھو۔ اپنے ہاتھ سے کھولو۔''

میں نے خود آگے بڑھنے کے بجائے ''ماں جی'' کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اور انہیں لیتا ہوا...... دروازے کی طرف بڑھا۔ ''دروازہ کھولو ماں جی۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

ماں جی نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ہیبت ناک صابو آٹھ دس گز کی دوری پر موجود تھا۔ اس کا پھیلا ہوا جسم کسی گوریلے کی طرح تھا۔ بالوں بھرے چاروں بازو متحرک تھے۔ وہ آگے بڑھا۔ ماں بازو پھیلا کر پوری جان سے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ اسے چومنے لگی۔ سہلانے لگی اور سمیٹنے لگی۔ صابو کی کربناک دہاڑیں پہلے بلند ہوئیں، پھر مدھم پڑنے لگیں۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب جیسے ڈھیلے پڑنے لگے۔ وہ اسے پچکارنے لگی۔ اس کے ہیبت ناک سر کو ہونٹوں سے چھونے لگی۔ وہ پُرسکون ہونے لگا۔ اپنی ماں کے بازوؤں میں چھپنے لگا۔ جیسے چوزہ مرغی کے پروں میں پناہ لیتا ہے۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جس کے انوکھے پن کو لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن ہی نہیں۔ اس رقت آمیز کیفیت کو بس محسوس کیا جاسکتا تھا...... اور ہم کر رہے تھے...... آتشیں اسلحہ صابو اور اس کی ماں کی طرف اٹھا ہوا تھا مگر اسلحہ تھامنے والے بھی کچھ دیر کے لیے اپنے اسلحے کو فراموش کر کے اس منظر میں محو ہو گئے تھے۔

دفعتاً جھماکا سا ہوا۔ کوئی لپک کر کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ جیکب تھا۔ اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ مدد کے لیے چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر انگلیوں کے گہرے سرخ نشان تھے۔ یہ وہ جھانپڑ تھا جسے کھا کر جیکب کی قلابازیاں لگی تھیں۔ کھلے ہوئے دروازے سے ایک پڑچھتی نظر آ رہی تھی۔ ایسی گیلری نما پڑچھتیاں سامان وغیرہ رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ جیکب خود کو بچانے کے لیے اسی پڑچھتی پر چڑھ رہا تھا۔

شوکت کے اشارے پر پولیس اہلکاروں نے جیکب کو حراست میں لے لیا۔ جیکب نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ شاید اس میں احتجاج کی سکت ہی باقی نہیں تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے سلویا کی طرف دیکھا۔ اس نے جیکب کے چہرے پر نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ ہارڈی سمیت اپنے تینوں ساتھیوں سے بے حد بدظن نظر آتی تھی۔ اس کی ساری توجہ ماں اور بیٹے کے ملاپ کی طرف تھی اور یہ ملاپ واقعی دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ بیٹا جسے ہاتھ لگانے سے بھی کراہت آتی تھی۔ ماں کے سینے سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ بڑی محبت سے اس کا بدوضع چہرہ چوم رہی تھی۔

پھر وہ اس طرح بیٹھ گئی کہ صابو کا چوڑا چکلا وجود اس کے سامنے آ گیا اور صابو کا سر اس کی گود میں محسوس ہونے لگا۔ وہ صابو کے ہونٹوں سے بہنے والی رال اپنی اوڑھنی سے پونچھنے لگی اور اپنے آنسو اس کے سر پر گرانے لگی۔

شوکت کا چہرہ پتھریلا سا محسوس ہونے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے فرض کی ادائی کے بارے میں سوچ رہا ہے...... اور فرض یہ تھا کہ صابو کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہوتی، اور پاؤں میں بیڑی لیکن یہ ہتھکڑی اور بیڑی اسے کون پہناتا؟

''کیا کیا جائے؟'' شوکت نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''میرا خیال ہے کہ تھوڑا سا انتظار کیا جائے۔''

''ہاں ایک کام ہو سکتا ہے۔'' شوکت کا چہرہ نئے خیال سے چمک گیا۔ ''کھانے میں کوئی نشے والی چیز ملائی جاسکتی ہے۔''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

شوکت نے ماں جی کو اشارہ کیا اور ہم صابو کو لے کر ایک دوسرے کمرے میں آ گئے۔ صابو کو چلتے پھرتے دیکھنا ایک عجیب تجربہ تھا۔ ہم تو اس ''تجربے'' کے تھوڑے سے عادی ہو گئے تھے لیکن جو پہلی بار اسے دیکھتا تھا بھونچکا رہ جاتا تھا۔ وہ اپنی ٹیڑھی لیکن نہایت مضبوط ٹانگوں کے ساتھ ڈولتا ہوا چلتا تھا اور چلتے ہوئے اس کے حلق سے ہلکی سی آواز بھی نکلتی تھی۔ ہم نے ابھی تک اس کے منہ سے بس غوں غاں...... خوخا...... اور ہو ہو کی آوازیں ہی سنی تھیں لیکن اس کی ماں ان آوازوں سے اس کا پورا مطلب جان جاتی تھی۔

جیکب وغیرہ نے اسے کھدر کا جو چغہ سا پہنایا تھا وہ اس کے گھٹنوں سے نیچے تک جا رہا تھا۔ چغے سے نیچے صابو کی ٹیڑھی پنڈلیاں اور بھدے پاؤں نظر آتے تھے۔ چغے پر ایک دو جگہ خون کے دھبے بھی تھے۔ یہ دھبے اس مار پیٹ کی علامت تھے جو کچھ دیر پہلے تک صابو سے جاری رکھی گئی تھی۔

☆=====☆=====☆

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد صابو حویلی کے ایک کمرے میں کچے فرش پر لمبا لیٹا تھا اور اس کے حلق سے خراٹوں کی مدھم آواز بلند ہو رہی تھی۔ پولیس والوں نے چاند کی مدد حاصل کی تھی اور گاؤں کے اندر سے ہی ایک حکیم صاحب سے ''افیون کا جوہر'' حاصل کیا تھا۔ اس دوا کی مناسب مقدار دودھ میں ملا کر صابو کو پلائی گئی تھی اور اب وہ زمین پر لمبا لیٹا تھا۔ ہم اسے پہلی بار اتنے قریب سے اور اتنے اطمینان سے دیکھ رہے تھے۔ وہ خطرناک حد تک طاقتور اور مضبوط تھا۔ اس کے جسم پر موجود لمبے بالوں نے ایک بار پھر مجھے جواں سال صغراں کی دردناک موت یاد دلا دی۔ اس بدنصیب کی گردن سے ایسے ہی بال چپکے ہوئے پائے گئے تھے...... اور پھر مجھے رحمت کی نوبیاہتا دلہن عصمت کا بیان یاد آیا۔ اسے صابو نے جنسی خواہش کے تحت بری طرح کچلا مسلا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس کی عزت اور جان بچ گئی تھی ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ نازک بدن عزت کے ساتھ ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی۔ عصمت نے بتایا کہ حملہ آور کے جسم سے سخت ناگوار بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی بو تھی جو ہم اب بھی صابو کے قریب سے محسوس کر رہے تھے۔

جب میں نے ان واقعات کے بارے میں سوچا تو زمین پر بدمست پڑے اس حیوان نما وجود سے کراہت عود کر آئی۔

شوکت نے ہتھکڑی اور بیڑی منگوالی تھی۔ لوہے کی کھڑکھڑاہٹ سن کر دکھیاری ماں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ شوکت ہتھکڑی لے کر صابو کی طرف بڑھا تو وہ دیوار بن کر راستے میں کھڑی ہو گئی۔ ''نہیں تھانیدار جی! میرے پتر کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ اب اس پر اور ظلم نہ کرو۔ یہ مر جائے گا تھانیدار جی اس پر اور مجھ پر رحم کرو۔''

''ماں جی! ہم مجبور ہیں۔ اس کی گرفتاری ضروری ہے۔ اس نے چار بندوں کے

خون سے ہاتھ رنگے ہیں...... اور...... عزتیں لوٹنے کی کوشش کی ہے......''

''یہ بے گناہ ہے پتر...... اس کا کوئی قصور نہیں...... تمہیں دھوکا ہو رہا ہے۔'' وہ کربناک انداز میں چلائی۔ اس کے اندر سے وہی روایتی ماں بول رہی تھی جو قدیم زمانوں سے اپنے لختِ جگر کو دنیا کے ہر الزام سے بری کرتی رہی ہے۔ چیخ چیخ کر دل کی گہرائیوں سے اس کی بے گناہی کی گواہی دیتی رہی ہے۔ بیٹا فرعون جیسا جابر حکمران ہو، چنگیز جیسا بے رحم لشکری ہو، شاہ فاروق جیسا عیاش ہو...... یا پھر سلطانہ ڈاکو ہو، ماں کے لیے معصوم اور قابلِ رحم ہی ہوتا ہے۔ یہ ماں کی آفاقی جبلت ہے اور اس جبلت نے رُوئے زمین کی معاشرت پر نا قابلِ فراموش نقوش چھوڑے ہیں۔

ماں...... شوکت کے سامنے تھی اور واویلا کر رہی تھی۔ میں نے اسے بہ مشکل سنبھالا اور تسلی تشفی دیتا ہوا دوسری طرف لے گیا۔ وہ ابھی تک فریاد کناں تھی...... ''میرے بچے کو ہتھکڑی نہ لگاؤ صاحب جی...... میں وعدہ کرتی ہوں تم سے...... وہ کچھ نہیں کرے گا...... جہاں تم لے جاؤ گے، وہیں چلا جائے گا۔ میں اسے چوں چرا نہیں کرنے دوں گی...... میں وعدہ کرتی ہوں۔''

''ہمیں تمہارے وعدے پر اعتبار ہے ماں جی لیکن یہ پولیس کی مجبوری ہے۔ ان کے اعلیٰ افسر آنے والے ہیں۔ ان کی نوکریاں جا سکتی ہیں۔ تم ان کی مجبوری کو سمجھو میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں۔ تمہارے بیٹے کو انگلی بھی نہیں لگائی جائے گی۔''

ماں کا سینہ ہچکیوں سے دہلتا رہا۔ دوسری طرف نیم بے ہوش صابو کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا دی گئی۔

☆=====☆=====☆

اگلے روز نو بجے تک ہارڈی اور اسمتھ بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ وہ رستم کے ساتھ فرار ہوئے تھے اور ایک نزدیکی قصبے سے پکڑے گئے تھے۔ سلویا میرے اور شوکت کے ساتھ ہی باغ پور واپس پہنچ چکی تھی۔ رات اس نے نوازش چاند کے گھر اس کی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزاری تھی۔ صبح سویرے نوازش چاند کا بڑا بیٹا آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ میم صاحب مجھے بلا رہی ہیں۔

میں منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر چاند کے گھر پہنچا۔ گھر کا سب سے اچھا کمرا سلویا کو دیا گیا تھا۔ چاند کا بڑا بیٹا میٹرک میں پڑھتا تھا۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی بھی سمجھ لیتا تھا۔ اس کی موجودگی میں سلویا کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں آسانی تھی۔ میں کمرے میں پہنچا تو سلویا نے چاند کے بیٹے اصغر کو سمجھا دیا کہ ہم ضروری بات کر رہے ہیں لہٰذا اس طرف کوئی نہ آئے۔ اصغر کے جانے کے بعد سلویا نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ کچھ دیر تک میرا ہاتھ تھامے کھڑی رہی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ تھی۔ تب وہ اچانک میرے بازوؤں میں آ گئی۔ اس کی مدھر خوشبو نے میرے حواس کو ڈھانپ لیا۔ ”میں نے تمہیں بہت مس کیا ہے آسلم۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”اور میں نے بھی۔“ میں نے ترت جواب دیا۔

اس کے بازوؤں کی گرفت کچھ اور سخت ہو گئی۔ وہ جیسے مجھ میں سما جانا چاہتی تھی۔ ممناتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”جی چاہتا ہے آسلم...... سب کچھ بھول بھال کر تمہارے ساتھ چل دوں۔ ان ساری مصیبتوں سے دور نکل جاؤں، لیکن......

”لیکن کیا؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں کچھ ضروری باتیں بتانا چاہتی ہوں۔“

”بتاؤ۔“

وہ آہستگی کے ساتھ مجھ سے الگ ہو گئی۔ جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ وہ بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا لیکن بیٹھنے سے پہلے میں نے دروازے کی کنڈی گرا دی۔ سلویا نے اپنے منتشر بال سمیٹے اور انہیں ہیئر بینڈ میں باندھا۔ اپنی نم آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے خشک کیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”آسلم، میں تمہیں صابو کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“

”میں بھی اس بارے میں سننا چاہتا ہوں۔“

وہ شستہ انگریزی میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”ہم یہاں سیر اور شکار کے لیے آئے تھے۔ مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ یہاں ایک اور ہی کہانی شروع ہو جائے گی...... ہم

نمبردار کے بیٹے روستم (رستم) کے ساتھ باغ میں گئے تھے، وہاں اتفاقاً ہم نے عجیب الخلقت صابو کو دیکھ لیا......“

”ہاں یہ واقعہ مجھے صابو کی ماں کی زبانی معلوم ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔

سلویا نے اس واقعے کو مختصر کر دیا اور بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”صابو کی عجیب جسمانی ساخت دیکھ کر جیکب اور ہارڈی کے ذہن میں ایک منصوبہ آ گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس حیران کن شخص کو کسی طرح اپنے ساتھ لندن لے جائیں۔ دراصل وہ اسے Freak Show کا حصہ بنانا چاہتے تھے......“

میں نے کہا۔ ”تم نے پہلے بھی Freak Show کا ذکر کیا تھا، یہ کیا چیز ہے؟“

”ہاں، میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ فریک شوز دراصل ایسے تماشے ہوتے ہیں۔ جن میں عجیب وغریب جسمانی ساخت رکھنے والے افراد کی نمائش کی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی بہت زیادہ دبلا شخص، کوئی حد موٹا شخص، کوئی غیر معمولی ٹھگنا یا لمبا شخص، پھر ایسے افراد جن کی ساخت میں کوئی نمایاں نقص ہوتا ہے۔ ان تماشوں میں جس شخص کا جسمانی عیب جتنا غیر معمولی ہوتا ہے وہ اتنا ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ سرکس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ ایسے افراد کی نمائش کر کے خوب دولت کماتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”سلویا! تمہاری بات سے مجھے بھی کچھ کچھ یاد آنے لگا ہے۔ شاید میں نے اس بارے میں کہیں پڑھا تھا...... لیکن میں نے تو یہ بھی پڑھا تھا کہ ایسے تماشوں کو انسانیت سوز قرار دے کر یورپ سے ختم کیا جا رہا ہے......“

”ختم کیا جا رہا ہو گا لیکن یہ ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوئے۔ لندن جیسے شہر میں بھی خفیہ طور پر ایسے شوز ہوتے رہتے ہیں اور ابھی پتا نہیں کب تک ہوتے رہیں گے......“

اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔ ”...... ہاں تو میں بات کر رہی تھی صابو کی...... جیکب اور ہارڈی کو یقین تھا کہ وہ صابو کے ذریعے انگلینڈ اور ہالینڈ وغیرہ میں بہت دولت کما سکتے ہیں۔ وہ ہر قیمت پر اسے یہاں سے لے جانا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے رستم کی مدد سے صابو کو اغوا کیا۔ وہ اسے تحصیلدار کے ٹھکانے پر لے جا رہے تھے۔ راستے میں صابو بپھر گیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ جیکب اور رستم وغیرہ نے اس کو بری طرح مارا

پیٹا۔ اس مار پیٹ کے دوران میں ہی صابو نے اپنی بندشیں توڑ دیں اور نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ یہاں باغ پور کے کھیتوں میں آ کر چھپ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا پتا ہم سب کو ہے...... بلکہ یہ ساری چونکا دینے والی خبریں اب اخباروں میں بھی چھپ چکی ہیں۔“

سلویا نے توقف کر کے اپنی پشت کرسی سے ٹکائی اور عمیق سانس لے کر بولی۔

”آسلم! ذاتی طور پر میری رائے یہی ہے کہ صابو رعایت کا مستحق ہے۔ بے شک وہ بہت زور آور ہے۔ تم اسے خطرناک بھی کہہ سکتے ہو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی سمجھ بوجھ ایک بچے سے زیادہ نہیں۔ اس نے جو کچھ کیا خوف زدگی کی حالت میں کیا۔ خود کو بچانے کے لیے کیا...... یا پھر اپنے جسم اور جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کیا۔ بے شک اس کے ہاتھوں سے قتل ہوئے ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ان سنگین واقعات کی ذمے داری صابو سے زیادہ ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اسے مشتعل کیا۔ ان لوگوں میں میرے تینوں ساتھیوں کے علاوہ رستم، چھوٹا چوہدری اور بڑا چوہدری بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف سائے کی طرح صابو کے پیچھے لگے رہے بلکہ اس کی دکھی ماں کو بھی حبسِ بے جا میں رکھا اور اسے اذیتیں دیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو سلویا، لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی تو ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”جیکب اور ہارڈی نے بالکل مختلف طرح کا بیان دیا ہے۔ ابھی مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ انہوں نے کیا کہا ہے لیکن شوکت کہہ رہا تھا کہ صابو کے خلاف مضبوط کیس بنتا دکھائی دیتا ہے......“

”وہ جو کہیں گے، غلط کہیں گے آسلم۔ ان کی حقیقت جتنا میں جانتی ہوں، تم میں سے کوئی اور نہیں جان سکتا۔ انہوں نے صابو اور اس کی ماں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اگر پولیس درمیان میں نہ آتی تو وہ پتا نہیں اور کیا کرتے۔ ان لوگوں کی فطرت سے تھوڑا بہت واقف تو میں پہلے ہی تھی مگر یہاں آ کر یہ ”بدترین لالچی“ اور مفاد پرست ثابت ہوئے ہیں۔ مجھے تو نفرت ہوگئی ہے ان لوگوں سے...... خاص طور سے ان دونوں

بھائیوں سے۔“

میں نے کہا۔ ”سلویا! میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ تم نے ضمیر کی آواز پر کان دھرے ہیں۔ بہرحال اب یہ ٹھوس حقیقت ہے کہ جیکب اور ہارڈی وغیرہ تمہاری جان کے دشمن ہو چکے ہیں۔ وہ مستقبل قریب میں تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

”میں یہ سب کچھ سمجھتی ہوں...... لیکن فی الحال تو وہ پولیس کی حراست میں ہیں۔“

”اس حراست کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتنی دیر تک رہے گی۔ میرے خیال میں یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ جیکب خاصا بااثر شخص ہے۔ سنا ہے کہ ڈی ایس پی اکرام شاہ سے بھی اس کا کوئی ”لنک“ نکل آیا ہے۔ یقیناً لاہور میں بھی اس کے تعلقات ہوں گے۔ ویسے بھی ولایتی لوگوں کے لیے ہمارا دیسی قانون بالکل پھسپھسا ثابت ہوتا ہے۔“

”چلو کچھ بھی ہے۔ آٹھ دس روز تو یہ لوگ پولیس کی حفاظت میں رہیں گے ہی۔ میں چاہتی ہوں کہ......“ وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

”کیا چاہتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور پھر حوصلہ جمع کر کے بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر واپس چلی جاؤں۔ وہاں اسکاٹ لینڈ میں میرے ایک انکل رہتے ہیں۔ جیکب اور ہارڈی کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ میں خاموشی سے وہاں دو تین سال گزار سکتی ہوں......“

میرے دل میں جیسے کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ اپنے اندر کی ہلچل پر میں نے بہ مشکل قابو پایا۔ وہ اداس نظروں سے میرا چہرہ تک رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”پھر دو تین سال بعد کیا کرو گی؟ مجھے نہیں لگتا کہ ہارڈی اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے بڑا قہر دیکھا ہے۔“

”میرا ارادہ ہالینڈ میں آباد ہو جانے کا ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ”وہاں میری والدہ کے قریبی رشتے دار آباد ہیں۔ شاید میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میری

والدہ ڈچ تھیں۔ وہ میرے والد سے پہلے ہی فوت ہوگئی تھیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ وہ بھی خاموش ہوگئی۔ کھڑکیوں سے باہر دور کہیں کھیتوں میں ڈیزل انجن کی کوکو سنائی دے رہی تھی۔ پاس کے کچے راستے پر مویشی اپنے گلے کی گھنٹیاں بجاتے رواں دواں تھے۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا۔ "ہالینڈ جا کر کیا کرو گی؟"

وہ عجیب اداسی بھرے لہجے میں مسکرائی۔ "کوئی اچھا سا ڈچ دیکھ کر شادی کرلوں گی۔ اس کے ساتھ مل کر گھر چلاؤں گی۔ اس کے بچوں کی ماں بنوں گی...... اور...... اتوار کو گرجے میں جا کر جہاں اور بہت سی دعائیں مانگوں گی، وہاں ایک دعا اور بھی مانگوں گی کہ دور پاکستان میں رہنے والا ایک شخص ہمیشہ خوش رہے، ہمیشہ مسکراتا رہے۔ وہ شخص جس نے مجھے محبت کے ایک نئے مفہوم سے آشنا کیا۔ جو صرف چند دن میرے ساتھ رہا لیکن جس کی خوشبو نے میری پوری زندگی کو ڈھانپ لیا۔"

میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میں نے سلویا کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ وہ شاید میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "کیا سوچ رہے ہو آسلم؟" میں نے اپنی نم آنکھوں کی پروا کیے بغیر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا سلویا، کہ تم یہیں میرے ساتھ رہ جاؤ۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر زندگی کا سفر طے کریں......"

اس کی روشن پیشانی پر کرب کی شکنیں سی ابھر آئیں۔ اپنے کسی اندرونی اضطراب سے دست و گریباں ہوتے ہوئے بولی۔ "سچ کہتی ہوں آسلم! جو محبت اور سچائی میں نے یہاں کچے پکے راستوں اور کھیتوں کھلیانوں میں دیکھی ہے دنیا کے بڑے بڑے چمکیلے شہروں میں نہیں دیکھی...... اس محبت اور سچائی کی ایک علامت تم بھی ہو آسلم...... مم میرے بس میں ہو تو میں تمہارا ہاتھ تھام کر زندگی بھر انہی کھیتوں اور گلی کوچوں میں گھومتی رہوں۔ میں یہاں کی ہر زبیدہ، ہر چاند اور ہر بابے صادق سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس پیار بھری خالص زندگی کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں نے پچھلے چند ہفتوں میں جو دشمنی پال لی ہے یہ مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں کہیں دور جا کر چند سال تک بالکل الگ تھلگ زندگی گزاروں۔"

"یہ الگ تھلگ زندگی ہم دونوں بھی تو گزار سکتے ہیں۔ ہم...... پاکستان کے ہی کسی چھوٹے بڑے شہر میں رہائش رکھ سکتے ہیں۔" میں نے اداسی بھرے لہجے میں کہا۔

اس نے ایک بار میری آنکھوں میں دیکھا، پھر جلدی سے سر جھکا لیا۔ اس کی شفاف پیشانی پر پھر کرب کی شکنیں نمودار ہوگئیں۔ "نہیں اسلم!" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "تم جیکب اور ہارڈی کی کینہ پرور فطرت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے...... یہ بڑے دھیمے لیکن بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ میں اپنے ساتھ تمہاری زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی...... کسی صورت نہیں ڈال سکتی...... پلیز اسلم...... مجھے معاف کر دو۔ پلیز۔"

وہ اٹھی اور اپنے آنسو چھپاتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔

دس بجے تک ڈی ایس پی اکرام شاہ ماتحت عملے کے ساتھ باغ پور پہنچ گئے۔ اخباری نمائندے بھی ساتھ تھے۔ صابو کے بازیاب ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹے چوہدری کی ہلاکت، اے ایس آئی نذیر کی موت اور چوہدری ارباب کی گرفتاری کی خبر نے بھی ہلچل مچائی تھی۔ تحصیلدار اور اس کے ہمنوا صبح سویرے ہی باغ پور آ گئے تھے۔ وہ جیکب اور اس کے ساتھیوں پر گرفت نرم کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

ڈی ایس پی اکرام کو شوکت کا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا کہ اس نے جیکب اور اس کے ساتھیوں کو عام لوگوں کی طرح لاک اپ میں ڈال دیا تھا۔ ڈی ایس پی صاحب کے آتے ہی ان لوگوں کو لاک اپ سے نکال لیا گیا۔ بہر حال عملی طور پر وہ پولیس کی تحویل میں رہے۔

اخباری رپورٹر صابو کی طرف یلغار کر رہے تھے۔ وہ اس کی زیادہ سے زیادہ تصویریں لینا چاہتے تھے۔ جو نئے لوگ آئے وہ اس زندہ عجوبے کو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اس کو تماشا بنایا جا رہا تھا۔ شوکت نے ایسے لوگوں کو سختی سے پیچھے ہٹا دیا۔ ان لوگوں کی توجہ صابو کی طرف سے ہٹی تو صابو کی غمزدہ ماں کی طرف ہوگئی۔ انہوں نے اپنے کیمروں اور نوٹ بکس کے ساتھ اشکبار "ماں جی" کو گھیر لیا۔ ان سے الٹے سیدھے سوال ہونے لگے۔ وہ ہر ایک کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھیں اور بس ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔ "میرے

صابر کو مجھ سے جدا مت کرو۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

صابو کا اصل نام صابر تھا۔

صابر عرف صابو کے سلسلے میں ڈی ایس پی اکرام نے جیکب وغیرہ کا طویل بیان قلمبند کیا۔ اس بیان سے تصویر کا ایک دوسرا رخ سامنے آتا تھا۔ اب پتا نہیں یہ ''رخ'' درست تھا یا غلط...... بہرحال جیکب کا بیان کچھ اس طرح تھا۔

''میرا نام جیک ہاور ہے۔ میں لندن میں ان ڈور اسپورٹس کا ریجنل انچارج بھی رہا ہوں۔ لندن کی سرکس کمپنی ''بلیو اسٹار'' میں حصے دار ہوں...... ہم یہاں پر سیر و شکار کے لیے آئے تھے اور تحصیلدار فیروز علی ٹوانہ صاحب کے مہمان تھے۔ یہ کوئی پانچ ہفتے پہلے کا ذکر ہے۔ میں اور میرے ساتھی ''کھوہ والی'' گاؤں کے معزز زمیندار رستم ملک کے ساتھ ان کا باغ دیکھنے گئے۔ وہاں ہم نے صابر عرف صابو کو دیکھا۔ اس کی جسمانی ساخت دیکھ کر ہمارے دل میں خیال آیا کہ اگر اس شخص کو ملک سے باہر لے جا کر سرکس میں ''پرفارم'' کرایا جائے تو یہ بہت کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہم نے صابو کی والدہ سے بات کی اور اس سلسلے میں اسے باقاعدہ اجازت طلب کی۔ ہم نے اس کی والدہ کو بتایا کہ فی الحال صابو کو لاہور لے جائیں گے۔ وہاں جا کر اس کے بارے میں مزید فیصلہ کیا جائے گا۔ صابو کی والدہ یعنی زینب نے ہمیں اجازت دی۔ ہم نے زینب کی حوصلہ افزائی کے لیے اسے معقول رقم بھی دی۔

جب ہم صابو کو بذریعہ گاڑی سرگودھا کی طرف لے جا رہے تھے، راستے میں وہ اچانک بپھر گیا۔ درحقیقت اس کی ماں نے غیر فطری طور پر اسے ہمیشہ عورت سے دور رکھا ہے۔ جوان عورت کو دیکھ کر وہ مشتعل ہو جاتا ہے اور اس کی جنسی بھوک شدت سے بھڑک اٹھتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو وہ خطرناک طور پر جنس زدہ ہے۔ گاڑی میں اس نے ہماری ساتھی سلویا کو دیکھا تھا اور اس کے بپھرنے کی وجہ سلویا ہی تھی۔ وہ کسی جنونی کی طرح اسے نوچنے کھسوٹنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ہم نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس دوران میں وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا اور کھیتوں میں غائب ہو گیا۔

یہ ہماری غلطی تھی کہ اس موقع پر ہم نے مقامی پولیس کو مطلع نہیں کیا اور اپنے طور پر

اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ گاؤں کے لوگوں میں خواہ مخواہ خوف و ہراس پیدا ہو۔ اس دوران میں صابو نے لوگوں پر حملے شروع کر دیے۔ پہلے اس نے بشیر کی جوان بیوی زبیدہ کو پکڑنے کی کوشش کی اور پھر بشیر کو مارا۔ پھر کھیتوں میں صغراں کو بے دردی سے قتل کیا...... بعد میں اس نے شکاری رازی جان کی جان لی۔ کمپاؤنڈر رحمت کا قتل اور اس کی دلہن پر مجرمانہ حملہ بھی صابو کی خصلت کا کھلا ثبوت ہے۔ دوسری طرف صابو کی ماں بھی ایک لالچی عورت ثابت ہوئی۔ جب صابو نے پہلا قتل کیا، یعنی بشیرے کو مارا تو ہ بھی باغ پور میں تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ صابو کو پکڑنے میں ہماری مدد کرتی، اس نے ہیں بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ وہ گاؤں میں خوف و ہراس پھیلانا چاہتی تھی۔ مجبوراً ہم نے چوہدری ارباب سے کہا اور انہوں نے اسے حویلی پہنچا دیا۔ وہ غلط کہتی ہے کہ اسے مارا ٹا گیا ہے۔ وہاں اسے ہر سہولت میسر تھی۔ ہم صرف صابو کے پکڑے جانے کا انتظار کر ہے تھے۔ اس کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دیتے......''

ڈی ایس پی اکرام اور تحصیلدار فیروز علی اس بیان کو بڑی اہمیت دے رہے تھے۔ ماف پتا چلتا تھا کہ ان کا جھکاؤ چوہدری ارباب اور جیکب وغیرہ کی طرف ہے۔ بے شک ے ایس آئی نذیر قتل ہوا تھا لیکن چھوٹے چوہدری کی موت کو زیادہ اچھالا جا رہا تھا۔ انستہ طور پر ایسا ماحول پیدا کیا جا رہا تھا کہ صابو ایک جنونی قاتل کے طور پر سامنے آئے رحالات کی تمام تر ذمہ داری اس پر ڈالی جا سکے۔

میرے اور شوکت کے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ سلویا ابھی تک ہماری ہی تحویل میں تھی۔ ں اور شوکت اس کے پاس پہنچے۔ شوکت نے جیکب کا سارا بیان سلویا کے گوش گزار کیا۔

وہ بولی۔ ''یہ جھوٹ کا پلندا ہے انسپکٹر! زینب پر بھی بہتان لگایا گیا ہے۔ اسے ایک ہ نہیں دیا گیا اور نہ اس سے صابو کو لے جانے کی اجازت لی گئی ہے۔ میں گواہ ہوں کہ لب اور رستم وغیرہ نے صابو کو زبردستی اس کی ماں سے چھینا اور اس بے چاری کو روتا پیٹتا وڑ کر صابو کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔''

''راستے میں صابو نے تم پر حملے کی کوشش کی؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل غلط ہے، بس اتنا ہوا تھا کہ وہ غصے میں آ گیا تھا۔ دراصل ہم اسے ایک وین

میں ڈال کر لے جا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے، وہ مسلسل جدوجہد کر رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے رال پونچھنا چاہی تو اس نے میرے بازو پر کاٹ لیا۔ اس کے بعد ہارڈی نے اسے تھپڑ مارنا شروع کر دیے......''

سلویا سے آدھ پون گھنٹا گفتگو کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ شوکت کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اعلیٰ افسروں کا جھکاؤ انگریزوں کی طرف ہے۔ اگر صابو کے حق میں واضح دلیلیں نہ ملتیں تو اس کا بری طرح پھنسنا لازمی تھا۔ بے شک سلو غیر جانبداری سے بات کر رہی تھی، لیکن وہ لوگ اسے بھی جھٹلا سکتے تھے۔

ہم نے اے ایس آئی نیاز کو اپنے ساتھ ملایا اور اس کیس کے تمام پہلوؤں پر از سر غور کیا۔ اس غور و فکر کے دوران میں ہم نے جیکب اور ہارڈی وغیرہ کے تفصیلی بیان کو بھی مدنظر رکھا۔

آخری نتیجہ نکالتے ہوئے شوکت نے کہا۔ ''صابو پر ٹوٹل چار بندوں کے قتل کا الزا ہے۔ یعنی بشیرا...... صغراں ...... رازی جان اور کمپاؤنڈر رحمت ...... ان میں سے صرف آخری قتل ایسا ہے جس میں اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ صابو نے یہ واردات اپ دفاع میں یا بھوک وغیرہ سے مجبور ہو کر نہیں کی...... بلکہ اس واردات میں اس کی جنس خواہش کو دخل تھا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' نیاز نے تائید کی۔ ''یہ قتل باقی تین وارداتوں سے نہیں کھاتا۔ مختلف نظر آتا ہے۔''

''اور میرے خیال میں یہی قتل ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں صابو کے خلاف زیادہ غم و غصہ پیدا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''لوگ بہت بھڑکے ہوئے ہیں۔'' اے ایس آئی نیاز نے کہا۔ ''رحمت کے گھر باہر آج صبح بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ رحمت کی ووہٹی (دلہن) کو ابھی تک غشی دورے پڑ رہے ہیں۔''

''اس واردات کے واقعات پر غور کیا جائے تو اس میں منصوبہ بندی نظر آتی ہے۔'' شوکت نے کہا۔ ''ایسی منصوبہ بندی ایک ہوش مند شخص ہی کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب

کہ صابو اتنا سیدھا سادا اور کم عقل نہیں جتنا اس کی والدہ بتاتی ہے اور جتنا وہ چہرے مہرے سے نظر آتا ہے...... استغاثہ اس کیس کو اتنا مضبوط کر سکتا ہے کہ ملزم پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے...... کیا خیال ہے تمہارا؟'' شوکت نے آخر میں میری رائے طلب کی۔

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے کہا ''پہلی وارداتوں میں جارحیت کی جائے دفاع نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں بشیرے اور صغراں کے قتل کے وقت ان ونوں کے قریب ہتھیار موجود تھے۔ بشیرے کی لاش کے پاس ''کسّی'' جب کہ صغراں کی ش کے پاس درانتی پڑی تھی۔ یوں لگتا ہے کہ ''قتل ہونے والے'' صابو کو دیکھ کر خوفزدہ وئے انہوں نے ان ہتھیاروں سے اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ نتیجے میں وہ ڈرا اور ن پر پل پڑا۔ اسی طرح چاند پر حملہ خوراک حاصل کرنے کے لیے کیا گیا۔ رازی جان کے قتل میں بھی ''دفاع'' نظر آتا ہے۔ مگر آخری واقعہ مختلف ہے۔''

''ہاں یہ واردات ایسی ہے جو صابو کو بری طرح پھنسا رہی ہے۔'' شوکت نے پھر سوچ لہجے میں کہا۔

اور واقعی ہم نے محسوس کیا تھا کہ اس واردات کے بعد صابو کے لیے ہر ہمدردی دم ڑ گئی تھی۔

ابھی ہماری بات چیت جاری تھی کہ مخبر چاند اپنی گول گول آنکھوں میں کسی پریشان کن خبر کا تاثر لیے اندر داخل ہوا۔

''کیا بات ہے؟'' شوکت نے چونک کر پوچھا۔

چاند نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈی ایس پی اکرام احب نے میم جی کا بیان لیا ہے۔ میم جی نے اپنے بیان وچ کئی ایسی باتیں کہی ہیں جو ہدری ارباب اور اس کے پروہنوں (مہمانوں) کے خلاف جاتی ہیں۔''

''اس بات کا تو ہمیں پہلے سے اندازہ تھا۔'' شوکت نے کہا۔

''لیکن جو دوجی بات ہے اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہوگا۔'' چاند نے اپنے مخصوص داز میں کہا۔

''کون سی بات؟''

''ہارڈی صاحب نے میم جی پر الزام لگایا ہے کہ وہ غداری کر رہی ہے۔ اس کا اسلم صاحب سے تعلق ہے اور وہ چوری چھپے ان سے ملتی بھی ہے۔''

یہ واقعی پریشان کن خبر تھی۔ بہر حال اس صورتِ حال کا بھی تھوڑا بہت پیشگی اندازہ ہمیں تھا۔

اب سارے معاملات کھل کر سامنے آتے جا رہے تھے۔

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''شوکت! میرا خیال ہے کہ ہمیں صابو سے آخری واردات کے بارے میں پھر تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ شاید کوئی نئی بات سامنے آ جائے۔''

''لیکن وہ تو کچھ بتاتا ہی نہیں۔'' شوکت نے بیزاری سے کہا۔ ''کبھی تو لگتا ہے کہ جان کر بالکل گونگا بن گیا ہے۔''

''اب ہمیں ایک سہولت حاصل ہے۔ ہم اس کی ماں سے مدد لے سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

یہ تجویز اے ایس آئی نیاز اور چاند وغیرہ کو بھی پسند آئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ''ماں جی'' کے ساتھ تھانے میں تھے۔ صابو ایک بار پھر اسی لاک اپ میں تھا جہاں سے ایک دن پہلے اسے چوہدری ارباب نے حوالدار رب نواز اور کانسٹیبل ڈوگر کی مدد سے اغوا کروایا تھا۔ لاک اپ کی تسلی بخش مرمت کروا دی گئی تھی۔ (یہاں پڑھنے والوں کو حوالدار رب نواز اور کانسٹیبل ڈوگر کے بارے میں بتاتا چلوں، یہ دونوں اہلکار قریباً چھ ماہ روپوش رہنے کے بعد کراچی کے علاقے ''گولی مار'' سے پکڑے گئے۔ حوالدار رب نواز نے جعلی انسپکٹر بن کر ایک حیدر آبادی لڑکی کو اپنی حبسِ بے جا میں رکھا اور اس کا بوگس نکاح نامہ بنوانے کی کوشش کی۔ اس واقعے کی تفتیش کے دوران میں وہ پکڑا گیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ وہی صابو کے کیس والا مفرور حوالدار رب نواز ہے۔ بعد میں رب نواز کی نشاندہی پر کانسٹیبل شاہنواز ڈوگر بھی قانون کی گرفت میں آ گیا۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ روداد ہے) ماں جی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات تھی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم صابو سے کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں۔ وہ دہائی دینے لگیں۔ ''میں تم کو کیسے

بتاؤں پتو! میرا صابو ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ نہ کسی کو بے وجہ مار سکتا ہے نہ کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ وہ لڑکی جھوٹ بولتی ہے۔ وہ غلط کہتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ماں جی! عدالت آپ کا بیان مان کر صابو کو بے گناہ نہیں سمجھ لے گی۔ اس کے لیے پکے ثبوتوں کی ضرورت ہے۔ اگر صابو نے یہ سب کچھ نہیں کیا تو پھر وہ اپنی صفائی میں کچھ بتائے۔ اگر بول کر سب کچھ نہیں بتا سکتا تو اشاروں کنائیوں میں ہی کچھ سمجھائے......''

کچھ دیر بعد میری اور شوکت کی بات ماں جی کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بولیں۔ ''میں اس سے پوچھ لوں گی۔ سب کچھ پوچھ لوں گی، لیکن...... پہلے مجھے اس سے اکیلے میں بات کرنے دو۔''

ہم نے ماں بیٹے کو تنہائی فراہم کر دی۔ بیٹا سلاخوں کے پیچھے تھا، ماں سلاخوں کے باہر تھی۔

جس وقت یہ بات چیت ہو رہی تھی، ڈی ایس پی صاحب کا آرڈر شوکت کے لیے آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ ملزم یعنی صابو کو فوری طور پر کورٹ میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ لیا جائے اور اس کام سے پہلے اس کی گرفتاری ڈالی جائے۔ اس کے علاوہ ملزم کی ماں کو بھی حراست میں لیا جائے۔

ڈی ایس پی اکرام شاہ کے ارادے واضح تھے۔ لگتا تھا کہ ریمانڈ کے بعد صابو کو بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا جانے والا ہے۔ وہ جو پہلے ہی مار پیٹ سے چُور تھا اور بھی چُور ہونے والا تھا۔

وقت بہت کم تھا...... اور تیزی سے گزر رہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم صابو اور اس کی والدہ کے روبرو پہنچے۔ عجیب الوضع صابو آہنی سلاخوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے ''چار ہاتھوں'' میں سے ایک ہاتھ سلاخوں سے باہر نکال رکھا تھا۔ یہ ہاتھ ماں کی گود میں پڑا تھا۔ جیسے یہ صرف ایک ہاتھ نہ ہو پورا وجود ہو۔ ماں جی آہستہ آہستہ صابو کے کندھے کو سہلا رہی تھیں۔ وہ کافی حد تک پُرسکون نظر آتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ مشتعل بھی نہیں ہوا۔ اس نے منہ سے کچھ ناقابلِ فہم آوازیں نکالیں...... ''ناؤں...... ناؤں......

غوغو......ناؤں......آبو......''

یوں لگتا تھا کہ دکھی انداز میں وہ ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔......

''یہ کیا کہتا ہے ماں جی؟''

وہ سسک کر بولی۔ ''یہ کہتا ہے، اس نے جمعے کی رات کسی کو نہیں مارا ہے۔ یہ تو بھوُ پیا سا جوہڑ کے پاس چھپا رہا ہے۔''

اتنے میں صابو پھر بولنے لگا۔ الفاظ ناقابل فہم تھے۔ ''آموں...... ناؤں..... ناؤں...... ہائے......'' ساتھ ساتھ وہ ہاتھوں کی حرکات سے بھی کچھ سمجھا رہا تھا۔ اس کے خون آلود ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔

ماں نے پھر ترجمانی کی۔ ''یہ کہتا ہے، مجھے ان لوگوں نے بہت مارا ہے، مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی......''

صابو کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

''ماں'' کے ذریعے ہمارے اور صابو کے درمیان قریباً دس منٹ تک بات ہوئی۔ اس ''بات چیت'' میں صابو کی طرف سے ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ اس نے الفاظ اور اشاروں کی مدد سے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی کہ جوہڑ کے کنارے سرکنڈوں کے اندر کسی کی لاش پڑی ہے......

اگر واقعی صابو کی اطلاع یہی تھی اور یہ اطلاع حقیقت تھی پھر کچھ مزید انکشافات بھی ہو سکتے تھے۔ کوئی نئی صورتِ حال سامنے آ سکتی تھی۔

ہم نے صابو کو ہتھکڑی اور بیڑی سمیت شوکت کی کھٹارا جیپ میں سوار کرایا۔ جیپ کو اوپر سے ڈھانپ دیا گیا، ورنہ صابو کو دیکھنے والوں کا ہجوم ہو جاتا اور ہمارے لیے گاؤں کی گلیوں سے گزرنا مشکل ہو جاتا۔ ماں جی بھی ہمارے ساتھ جیپ میں سوار تھیں۔ ہم صابر عرف صابو کو بڑی احتیاط کے ساتھ گاؤں سے باہر لائے اور پھر جوہڑ پر پہنچ گئے۔ انہی سرکنڈوں میں ہم نے چند روز پہلے ہنگامہ خیز ہانکا کیا تھا اور صابو کو پکڑا تھا۔ آج پھر صابو ہمیں ان سرکنڈوں میں لے آیا تھا۔

جیپ کو ایک طرف روک کر ہم سرکنڈوں میں آ گئے۔ اے ایس آئی نیاز بھی

چند اہلکاروں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار وہاں پہنچ گیا۔ بہرحال عام لوگ ہماری اس کارروائی سے بے خبر ہی رہے تھے۔ صابو کے پاؤں میں بیڑی تھی۔ اسے ایک طرف سے شوکت اور دوسری طرف سے میں نے سہارا دیا۔ وہ ہمارے سہارے آہستہ آہستہ چلتا سرکنڈوں میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ ہمیں جنوبی رخ سے سرکنڈوں میں لایا تھا...... چلتے ہوئے صابو جب اپنا بے ڈول جسم ہلاتا تھا تو اس کے حلق سے آوازیں نکلتی تھی۔ جیسے اس کی سانس گلے میں پھنستی ہو۔ چلنے کے دوران میں اس کے چاروں بازوؤں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنا ایک عجیب تجربہ تھا۔

اگر صابو کا بیان درست تھا اور سرکنڈوں میں واقعتاً کوئی لاش موجود تھی تو پھر کئی باتیں سوچی جا سکتی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ اس لاش اور کمپاؤنڈر رحمت کی موت میں کوئی تعلق ہو۔ یہ کمپاؤنڈر رحمت کے قاتل کی لاش بھی ہو سکتی تھی۔ وہی قاتل جس نے رحمت کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا اور اس کی دلہن پر مجرمانہ حملہ کیا اور اگر یہ دونوں کام صابو نے نہیں کیے تھے تو پھر اس کے لیے ہمدردی کی گنجائش موجود تھی۔ دلوں میں وہ سارے نرم گوشے پھر سے زندہ ہو سکتے تھے جن کا تعلق صابو سے تھا...... پھر اصل ذمے داری صابو پر نہیں ان لوگوں پر عائد ہونے لگتی جنہوں نے صابو کو اس گورکھ دھندے میں پھنسایا۔ اپنے مفاد کی خاطر صابو اور اس کی ماں کی جمی جمائی زندگی کو اکھاڑا۔ پتا نہیں کیوں، میرے دل کے اندر سے بھی یہ آواز آنے لگی تھی کہ آخری قتل صابو نے نہیں کیا۔

ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ صابو ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ آخر ہم سرکنڈوں کے درمیان، پانی سے بھرے ہوئے ایک چھوٹے سے گڑھے کے کنارے پہنچ گئے۔ سہ پہر کی دھوپ نے دور دور تک سنہری چادر تان رکھی تھی۔ پس منظر میں آسمان نیلا تھا۔ گڑھے کے اوپر چند گدھ منڈلا رہے تھے اور گڑھے کے یخ بستہ پانی میں ایک لاش تیر رہی تھی۔ ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کے سر پر گہرا زخم تھا۔ اس زخم کو دیکھتے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ وزنی گلدان کے کنارے سے لگا ہوگا۔ چھ دن پہلے جب ہم صابو کے لیے ان سرکنڈوں میں ہانکا کر رہے تھے، اس وقت بھی یہ لاش یہیں پر موجود تھی لیکن ہانکا چونکہ اس مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا

تھا لہٰذا لاش نگاہوں سے اوجھل رہی۔

صابو لاش کی طرف اشارہ کرنے لگا اور ناقابل فہم الفاظ میں کچھ کہنے لگا۔

اگلے ایک گھنٹے میں لاش کو بڑی احتیاط سے گڑھے میں سے نکالا گیا اور تھانے میں پہنچا دیا گیا۔ لاش پائے جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح علاقے میں پھیل گئی۔ علاقے کے باشندے انگشت بدنداں تھے۔ ایک کے بعد ایک سنسنی خیز خبر انہیں مل رہی تھی۔ لاش کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ پانچ چھ دن پرانی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں مرنے والے کو پہچان لیا گیا۔ پھولے ہوئے جسم اور نیلے چہرے والے اس مردہ شخص کا نام قادر بخش تھا۔ وہ قریبی گاؤں ''شکر وال'' کا رہنے والا تھا اور اس کا تعلق مرحوم کمپاؤنڈر رحمت کی ''نو بیاہتا بیوہ'' کے رشتے داروں سے تھا۔ یہ کافی صحت مند اور چوڑا چکلا شخص تھا۔ اگر اسے پہلوان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے جسم پر شلوار قمیص اور جرسی تھی۔ پاؤں میں پشاوری طرز کی چپل تھی۔ اس شخص کے لباس پر بھی خون کے پرانے دھبے موجود تھے۔ یقیناً یہ وہی خون تھا جو اس کے سر سے بے تحاشا بہا تھا۔

اگلے ایک گھنٹے میں قادر نامی اس شخص کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سب کچھ معلوم ہو گیا۔ پتا چلا کہ یہ شخص کمپاؤنڈر رحمت کا رقیب تھا۔ یہ شخص عصمت سے شادی کا خواہش مند تھا۔ بہرحال رحمت اور عصمت کے خاندان میں سے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قادر نامی اس شخص کی رقابت اتنی گہری اور سنگین ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو رحمت کے بہیمانہ قتل کے بعد کسی نہ کسی کا دھیان اس بندے کی طرف ضرور جاتا۔ یہ شخص نہ صرف شادی میں شریک ہوا تھا بلکہ انتظامات میں پیش پیش تھا۔

قادر کے سر کا زخم چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ یہ وزنی گلدان کے کنارے سے لگنے والا زخم ہے۔ قادر کی گردن اور چہرے پر ناخنوں کے نشان یقیناً نو بیاہتا دلہن کے ہاتھوں سے آئے تھے۔ صورتِ حال ایک دم بدلی ہوئی محسوس ہونے لگی...... درحقیقت رحمت کے قتل کے موقع پر کوئی بھی قاتل کو دیکھ نہیں پایا تھا۔ نہ قاتل کا کھرا اٹھایا جا سکا تھا۔ اس واردات میں اہم بیان رحمت کی دلہن عصمت کا ہی تھا۔ اس کے ساتھ بھی جو کچھ ہوا تھا گہری تاریکی میں ہوا تھا۔ وہ قاتل کو نہیں دیکھ سکی تھی نہ اس کی آواز سن سکی تھی۔ بس اس

نے قاتل کی غیر معمولی جسامت اور بو کے بھبکوں کا ذکر کیا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ ہمارے ذہن فوراً صابو کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔

ڈی ایس پی اکرام شاہ بھی اس نئی پیش رفت سے خاصے متاثر نظر آتے تھے۔ انہوں نے لاش کا معائنہ کیا اور رحمت کے والد سے سوالات پوچھے۔ اسی دوران میں شوکت کا موٹا (لیکن ہوشیار) مخبر چاند ایک اہم اطلاع لے آیا، اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کو ہم نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا تو یاد آ گیا۔ اس کا نام طیفا تھا۔

چاند نے شوکت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب، یہ وہی منڈا ہے جس کے پاس ہم بشیرے کے قتل کے بعد گئے تھے۔ میلے میں اس کی گھوڑی نے اللہ بخشے بشیرے کے کپڑوں پر چھینٹے ڈال دیے تھے۔ جس کے بعد بشیرے نال اس کی لڑائی ہوئی تھی۔''

وہ سارا واقعہ مجھے یاد تھا۔ بشیرے کے قتل کے بعد ہم نے اس لڑکے کو قریبی گاؤں کٹھالی سے پکڑا تھا۔ چونکہ یہ کبڈی کا کھلاڑی تھا اس لیے اسے پکڑنے میں پولیس والوں کو کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی۔ بعد میں اس پر شک غلط ثابت ہو گیا تھا اور اسے چھوڑ دیا گیا تھا۔ آج یہ لڑکا چاند کے ساتھ ایک گواہ کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔

چاند نے کہا۔ ''جناب! جس رات رحمت کا خون ہوا...... طیفے نے قادر بخش کو دیکھا تھا۔''

شوکت نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ تم طیفے کو خود بات کرنے دو۔''

چاند نے طیفے کو بولنے کے لیے کہا، طیفا بولا۔ ''میں اس رات اپنے یاروں کے ساتھ سرگودھے سے منڈوا (فلم) دیکھ کر آیا تھا۔ رات کوئی نو بجے کے قریب ہم گاؤں کے پاس ہی تھے، میں نے قادر بخش کو کھیتوں کے درمیان سے گزر کر باغ پور کی طرف آتے دیکھا۔ میں نے اسے آواز دے کر روکا اور پوچھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ وہ تھوڑا سا پریشان ہو گیا تھا۔ کہنے لگا اس کے ایک جاننے والے کی ماں سخت بیمار ہے۔ اس کا پتا کرنے جا رہا ہے۔''

شوکت نے طیفے نامی اس لڑکے سے چند سوال کیے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غلط بیانی

نہیں کر رہا تھا۔ یہ بھی اس کی جرأت مندی تھی کہ وہ پولیس کے روبرو بیان دینے آ گیا تھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر لوگ کہاں بولتے ہیں۔ یہ لڑکا مجھے پہلی نظر میں ہی دلیر اور ہمت والا لگا تھا۔ ایک عجیب سی خودسری اور بے پروائی تھی، اس کے اندر......

طیفے کے خلفیہ بیان نے صورتِ حال کچھ اور بھی واضح کر دی۔ دیگر بیانات بھی لیے گئے۔ کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی۔ رحمت کے قتل کے حوالے سے کئی باتیں کلیئر ہو گئیں۔

دراصل قادر نامی اس شخص نے گاؤں میں ہونے والی پے در پے خونی وارداتوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے رحمت کے گھر میں داخل ہو کر اسے قتل کیا اور پھر خوف زدہ دلہن پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی۔ اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو اس واردات کے لیے ''موقع'' کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ یہ شادی والا گھر تھا۔ مہمان موجود تھے...... پکڑے جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ اس کے باوجود قادر خود کو باز نہیں رکھ سکا۔ درحقیقت اس رات وہ شراب کے نشے میں چُور تھا۔ اس نشے نے اس کے اندر کی خواہش کو جگا دیا تھا اور اس کے سوا سب کچھ سلا دیا تھا۔

دلہن عصمت نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ گہری تاریکی میں وہ کچھ نہیں دیکھ سکی، بس اسے حملہ آور کے جسم سے بو کے ناگوار بھبکے اٹھتے محسوس ہوئے۔ اس بو کے حوالے سے بھی ہمارا دھیان فوراً صابو کی طرف ہی گیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ درحقیقت یہ ''شراب خانہ خراب'' کی بدبو تھی۔ قاتل نے اندھا دھند شراب پی رکھی تھی۔ بعد میں یہی شراب اس کی موت کا سبب بنی۔ دلہن عصمت کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد وہ پناہ لینے کے لیے سرکنڈوں میں جا گھسا۔ گہری تاریکی اور مدہوشی کے سبب وہ گڑھے میں جا گرا۔ سر کے زخم نے بھی اس کی موت میں کردار ادا کیا۔

☆=====☆=====☆

چند گھنٹے کے اندر اندر یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی کہ کمپاؤنڈر رحمت کا قتل عجیب الخلقت صابو کے ہاتھوں نہیں ہوا۔ اس خبر نے صابو کے حوالے سے لوگوں کے غم و غصے کی شدت ایک دم کم کر دی۔ چوہدری ارباب اور انگریزوں کی کارستانیاں منظرِ عام پر آنے کے بعد بہت سے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ لوگ بھی خون خرابے کے

ذمے دار ہیں۔ دھیرے دھیرے لوگوں کے غم و غصے کا رخ صابو کی طرف سے چوہدری ارباب اور جیکب وغیرہ کی طرف مڑنے لگا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی کہ صابو کی حیثیت ایک سہمے ہوئے جانور کی سی تھی۔ اسے سہا ڈرا کر خطرناک بنانے والے چوہدری کے انگریز مہمان ہی تھے۔ وہ صابو کو اس کی ماں سے جدا کر کے ولایت لے جانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے رہے تھے۔ یہ ان کے حربے اور اوچھے ہتھکنڈے ہی تھے جنہوں نے صابو کو اپنی حفاظت کے لیے لوگوں کی جان لینے پر مائل کیا۔

یقیناً یہ ساری باتیں ڈی ایس پی اکرام شاہ کی سمجھ میں بھی آ گئی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ڈی ایس پی کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوتا تھا لیکن ڈی ایس پی کی اپنی مجبوریاں بھی تھیں۔ وہ بھی اپنے اعلیٰ افسروں کو جوابدہ تھے اور اعلیٰ افسروں کا جھکاؤ انگریزوں کی طرف تھا۔ دوسری طرف تحصیلدار اور اس کے بھائی بند بھی اپنا پورا اثر رسوخ استعمال کر رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ صابو کی گرفتاری ڈال کر اسے کورٹ میں پیش کرنے کا کام ایک روز کے لیے ملتوی ہو گیا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہمت کر کے ڈی ایس پی صاحب سے اکیلے میں بات کروں اور انہیں صابو کے لیے اپنی رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کروں...... میں ڈی ایس پی کی حیثیت اور مرتبے کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ڈی ایس پی اکرام شاہ صرف پولیس ملازم ہی نہیں تھے...... ان کی ایک مضبوط سیاسی حیثیت بھی تھی۔ اکرام شاہ کا بڑا بھائی وفاقی حکومت میں ایک اہم عہدیدار تھا اور اس کا چچا صوبائی وزیر تھا۔ باخبر لوگ اکرام شاہ کو ایک پولیس ملازم سے زیادہ ایک مضبوط سیاسی خاندان کے فرد کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اکرام شاہ اس کیس میں جو چاہے کر سکتا ہے۔

میں شش و پنج میں تھا کہ اکرام شاہ سے بات کروں یا نہیں پھر میرے ذہن میں سلویا کا ہیولا ابھر آیا۔ ایک عورت ہوتے ہوئے اس نے کتنی جرأت مندی کا ثبوت دیا تھا۔ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر حق بات کہی تھی۔ اپنے دیرینہ ساتھیوں کی دشمنی مول لی تھی، جان کا خطرہ اٹھایا تھا، بدنامی سہی تھی لیکن کہا وہی تھا جو اس نے سچ سمجھا تھا۔

سلویا کی جرأت مندی کا سوچ کر میرے اندر بھی نیا عزم بیدار ہوا۔ میں صحافیانہ

بے باکی کے ساتھ سیدھا ڈی ایس پی اکرام شاہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ اس وقت تھانے میں شوکت کے کمرے میں ہی بیٹھے تھے۔ دو اور افسر بھی موجود تھے۔ کمپاؤنڈر کے قاتل یعنی قادر کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کی جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سر! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

ڈی ایس پی اکرام نے مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے دونوں ماتحتوں کو تھوڑی دیر کے لیے باہر بھیج دیا۔ رسمی کلمات کی ادائی کے بعد میں نے کہا۔ ''سر! آپ کے پیشہ ورانہ فرائض میں دخل اندازی کرنا میرا مقصد ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف اپنی ناچیز رائے سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ میں اس سارے معاملے کو شروع سے بڑے دھیان کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں۔''

ڈی ایس پی صاحب بولے۔ ''میرے پاس وقت کم ہے۔ آپ نے جو کہنا ہے مختصر کہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مختصر یہ ہے سر کہ سلویا وہ لڑکی ہے جو پچھلے دو تین ماہ میں ہر وقت جیکب اور ہارڈی وغیرہ کے ساتھ رہی ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں جتنا وہ جانتی ہے کوئی اور نہیں جان سکتا...... اور سلویا برملا کہہ رہی ہے کہ صابو بے قصور ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس کے ذمے دار صرف اور صرف اس کے ساتھی ہیں۔''

''لیکن سلویا کے بارے میں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ آپ سے ملتی ہے۔''

''مجھے معلوم تھا سر! آپ یہ نکتہ اٹھائیں گے۔ میں پوری ذمے داری کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلویا کے ساتھ میری جان پہچان بعد میں ہوئی وہ اس سے بہت پہلے اپنے ساتھیوں کے کردار سے متنفر ہو چکی تھی۔ اس نے صابو کی بے چارگی بھی اچھی طرح دیکھ لی تھی اور جیکب وغیرہ کی من مانی بھی۔ ایک عورت کی حیثیت سے سلویا نے صابو کی ماں کا درد پوری شدت سے محسوس کیا...... اور یہ واقعی محسوس کرنے والی چیز تھی سر...... ایک بیٹا جس کا اپنی ماں کے سوا اور کوئی نہیں...... اور ایک ماں جس کا اپنے بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں...... اور وہ بیٹا، سر! کوئی کماؤ پوت نہیں ہے، نہ ہی کوئی چاند کا ٹکڑا ہے، نہ ہی اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں وہ تو ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتا، اپنی رال بھی صاف نہیں کر

سکتا۔ وہ اس کی ایک پل کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ یہ کیسے سہہ لے کہ اس کے بیٹے کو لوگ سات سمندر پار لے جائیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اور وہ بیٹا کیسے برداشت کر لے کہ اسے اس کی ماں سے دور کر دیا جائے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے سر! کچھ لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی کمینگی اور لالچ کی وجہ سے ہوا ہے......!''

میں نے اپنے دل کی ہر بات کھول کر ڈی ایس پی صاحب کے سامنے بیان کر دی۔ وہ توجہ سے سنتے رہے۔ گاہے بگاہے انہوں نے مجھ سے سوالات بھی کیے۔ ان کا رویہ کافی بدلا ہوا محسوس ہوتا تھا لیکن یہ بات بھی واضح تھی کہ ان پر کئی طرح کا دباؤ تھا۔

اپنی زندگی میں بہت سے پولیس والوں سے میرا واسطہ پڑا ہے لیکن اکرام شاہ کو میں نے بالکل مختلف پایا۔ انسان دوستی اور حق پسندی اکرام شاہ کی نمایاں خصوصیات تھیں اور آخر تک یہ صفات اس کی زندگی کا خاصہ رہیں۔

اکرام شاہ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کے سارے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ہی کوئی کارروائی کرے گا۔

اس رات میں اور شوکت کافی پریشان تھے۔ ہمیں صاف پتا چل رہا تھا کہ جیکب اور ہارڈی کے حواری خود کو بچانے اور صابو کو پھنسانے کے لیے پورا پورا زور لگا رہے ہیں۔ یقیناً ان کے ذہنوں میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ اس کیس کو عدالت میں جانے سے پہلے تسلی بخش طور پر خراب کر دیا جائے۔

سلویا ابھی تک نوازش چاند کے گھر میں پناہ گزین تھی۔ میں نے ڈی ایس پی سے ملاقات کے دوران ڈی ایس پی صاحب سے یہ گزارش کی تھی کہ سلویا کی حیثیت اس کیس میں سلطانی گواہ کی سی ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا جائے۔ ڈی ایس پی صاحب نے نوازش چاند کے گھر پر گارڈ کا بندوبست کر دیا۔ سلویا کا خیال آتے ہی سینے میں عجیب سا دھواں بھر جاتا تھا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ سلویا وہی کرے گی جو اس نے کہہ دیا ہے۔ وہ مجھے اداس اور نمناک یادوں کا تحفہ دے کر سمندر پار چلی جائے گی۔ میرے روکنے کے باوجود نہیں رکے گی...... اور جب اسے رکنا نہیں تھا تو پھر خود کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سارے آنسو سینے میں گرا کر ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا

لوں گا۔ اگر خود سے اس کے دل میں میرے لیے کوئی مثبت خیال آ جائے تو ٹھیک ورنہ اس کی دی ہوئی جدائی کو استقامت کے ساتھ گلے سے لگا لوں گا......

اگلے روز ہمیں صبح سویرے ہی پتا چل گیا کہ حالات میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ صابو کا ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے اسے سرگودھا لے جایا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک بڑے سائز کی بند جیپ رات پچھلے پہر باغ پور پہنچ چکی تھی۔ شوکت کا خیال تھا کہ ریمانڈ حاصل کرنے کے بعد صابو کو واپس باغ پور نہیں لایا جائے گا۔ اسے سرگودھا کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں رکھ کر تفتیش کی جائے گی۔

پورے گاؤں میں لوگ یہاں وہاں ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ لوگوں کی اکثریت کی رائے تبدیل ہو چکی تھی۔ ان کی ہمدردیاں اب عجیب ہئیت والے صابو کے ساتھ تھیں اور تو اور شکاری رازی جان کے گاؤں والے بھی اب صابو کے بجائے فرنگیوں کی بات کر رہے تھے اور انہیں رازی جان کے قتل کا مجرم ٹھہرا رہے تھے۔ میں نے گھومتے پھرتے گاؤں کے کئی افراد سے بات کی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ صابو پر سخت کیس نہ بنایا جائے......اور اگر کسی طرح اسے معافی مل جائے تو یہ سب سے اچھی بات ہوگی۔

بہرحال یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر صابو کی قسمت بہت اچھی بھی ہوئی تو اسے کئی سال تک جیل میں رہنا پڑے گا یا ممکن تھا کہ اسے دماغی اسپتال میں بھیجنے کی کوشش کی جاتی۔ ہر دو صورتوں میں ماں سے طویل جدائی اور سخت اذیتیں اس کا مقدر نظر آتی تھیں۔

دوپہر سے ذرا پہلے صابو کو حوالات سے نکالا گیا اور بند گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ اسے عدالت میں پیش کرنے کے لیے سرگودھا لے جایا جا رہا تھا۔ لوگوں کو پتا نہیں کس طرح اس واقعے کی خبر ہو گئی۔ صابو کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سینکڑوں لوگ تھانے کے باہر جمع ہو گئے۔ جس وقت صابو گاڑی میں سوار ہو رہا تھا کسی شخص نے جا کر ''ماں جی'' کو اطلاع دے دی۔ ماں جی کو بتایا گیا کہ اس کے بیٹے کو شہر لے جایا جا رہا ہے جہاں اسے الٹا لٹکایا جائے گا اور مارا پیٹا جائے گا۔

وہ ماں تھی۔ اس کے سینے میں ممتا سے بھرا ہوا دل تھا۔ وہ کیسے خاموش رہتی۔ وہ آہ و

بکا کرتی ہوئی شوکت کے گھر سے نکل آئی۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگتی وہ تھانے پہنچ گئی۔ سنتریوں نے اسے روکنا چاہا۔ وہ ان سے الجھ گئی۔ انہیں دھکے دیتی ہوئی وہ تھانے کی ڈیوڑھی میں آ گئی۔ ڈیوڑھی میں بھی اہلکار موجود تھے۔ سنتری چیخے۔ ''مائی کو روکو......مائی کو پکڑو۔''

اہلکار اس کی طرف لپکے۔ اس کے ناتواں جسم میں ماں کا لہو جوش مار رہا تھا۔ کس میں اتنی سکت تھی کہ اسے روک سکتا! وہ انہیں دھکیلتی اور مارتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''صابو......میرے صابو!'' وہ چیخ رہی تھی۔

بند گاڑی میں صابو نے بھی اس کی آواز سن لی۔ وہ ناقابلِ فہم آوازوں میں ماں کو پکارنے لگا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ ماں دیوانہ وار گاڑی سے چمٹ گئی۔

''چھوڑ دو میرے صابو کو......خدا کے لیے چھوڑ دو۔''

پولیس والے اسے کھینچنے لگے۔ گاڑی حرکت میں آ گئی۔ وہ خود کو چھڑا کر گاڑی کے سامنے گر گئی۔ ''میں صابو کو نہیں جانے دوں گی۔ میں اپنے بچے کو نہیں جانے دوں گی۔'' وہ گاڑی کے ٹائر سے لپٹ گئی۔ اندر صابو کرب سے چیخ رہا تھا۔

تحصیلدار فیروز ٹوانہ نے کڑک کو پولیس اہلکاروں سے کہا۔ ''کیا تماشا دیکھ رہے ہو۔ ہٹاؤ اس خبیث مائی کو پیچھے۔''

ڈی ایس پی اکرام شاہ نے بھی نسبتاً نرم لفظوں میں یہی بات دہرائی۔ پولیس اہلکار غصہ کھا کر ماں جی پر پل پڑے۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے گاڑی سے کئی گز پیچھے لے گئے لیکن جب انہوں نے ماں جی کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ پھر جدوجہد کرنے لگی۔ وہ کبھی پولیس اہلکاروں کے سامنے ہاتھ جوڑتی تھی۔ کبھی پاؤں کو ہاتھ لگاتی تھی، کبھی اپنے ناتواں جسم کی ساری طاقت خرچ کر کے جیپ کے پیچھے جانے کی کوشش کرتی تھی۔ جیپ کے اندر صابو غضب ناک ہو رہا تھا۔ اس کی چنگھاڑیں لرزہ خیز ہوتی جا رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی جیپ کو الٹا دے گا۔ جیپ بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔

ماں جی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے کپڑے مٹی میں لتھڑ گئے اور وہ بے چارگی کی تصویر نظر آنے لگی۔ جب اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر ایک انسپکٹر کو تھپڑ مارے تو

اہلکاروں نے اسے پھر زمین پر گرا دیا اور بے دردی سے کمرے کی طرف گھسیٹنے لگے۔

یقیناً صابو نے بھی گاڑی کی جالیوں میں یہ منظر دیکھا اور پھر وہ واقعہ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی...... ایک ایسا منظر سامنے آیا جس نے ہر ایک کو سکتہ زدہ کر دیا۔ پولیس کی گاڑی زور سے ہلی۔ یوں لگتا تھا کہ گاڑی کے اندر تہلکہ مچ گیا ہے۔ صابو کی چنگھاڑیں فلک شگاف تھیں۔ جب ڈرائیور نے گاڑی پھاٹک کی طرف موڑنے کی کوشش کی وہ دھماکے سے الٹ گئی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ صابو سمیت دو تین پولیس اہلکار لڑھکتے ہوئے باہر گر گئے...... میں نے قریباً پندرہ گز کی دوری سے صابو کو دیکھا...... خدا کی پناہ...... وہ سرتاپا بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی خونی درندے کی سی سرخی تھی۔ اس نے ہتھکڑی میں بندھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پوری قوت سے ایک اے ایس آئی کے سر پر ضربیں لگانا شروع کیں۔ دو ہی ضربوں سے اے ایس آئی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

تھانے کے احاطے میں چیخ پکار مچ گئی۔ لوگ دہشت کے عالم میں چاروں طرف دوڑنے لگے۔ اس دوران میں ایک فربہ اندام تھانیدار صابو کی گرفت میں آ گیا۔ صابو نے اسے اپنے ''ہتھکڑی لگے ہاتھوں'' کے حلقے میں جکڑ لیا تھا۔ وہ وحشیانہ قوت سے اسے بھینچنے لگا اور تھانیدار کے حلق سے کربناک آوازیں نکلنے لگیں۔ صابو کے دونوں اضافی ہاتھ جو نسبتاً کم طاقتور تھے، رسیوں میں جکڑے تھے اور اس کی ناف پر رکھے تھے۔

تھانیدار کو جاں بہ لب دیکھ کر ڈی ایس پی اکرام اور شوکت نے پستول نکال لیے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گولی کیسے چلائیں۔ صابو تھانیدار سے گتھم گتھا تھا اور گولی کسی کو بھی لگ سکتی تھی۔ اس دوران میں ایک اونچے لمبے کانسٹیبل نے دلیری کا مظاہرہ کیا اور اپنی وزنی لاٹھی سے صابو کے سر پر پے در پے ضربیں لگائیں۔ کانسٹیبل کو دیکھ کر چند دوسرے اہلکار بھی آگے بڑھے۔ کسی نے لاٹھی ماری، کسی نے بندوق کا وزنی کندہ مارا۔ صابو کرب سے چیختا ہوا گھٹنوں کے بل گر گیا۔ نیم بے ہوش ''شہری تھانیدار'' کو گھسیٹ کر صابو کی آہنی گرفت سے نکالا گیا۔ صابو نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے مارنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔ چند سیکنڈ بعد وہ اوندھے منہ زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا سر اور

چہرہ...... لہولہان تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا اور پہلی بار مجھے پتا چلا کہ اس کے پاؤں بھی بیڑی میں جکڑے ہوئے ہیں۔

پولیس اہلکاروں نے مل کر الٹی ہوئی گاڑی کو سیدھا کیا۔ گاڑی الٹنے سے بھی دو اہلکار زخمی ہوئے تھے۔ آگے بیٹھے ہوئے ایک انسپکٹر کا بازو گاڑی کے نیچے دب کر چکنا چور ہو گیا تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ ''ماں'' کی چیخ پکار سنائی نہیں دے رہی میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ برآمدے میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ شوکت اور چند دوسرے اہلکار اسے ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

رقت آمیز منظر تھا۔ ایک طرف ماں بے ہوش پڑی تھی۔ دوسری طرف بیٹا نیم بے ہوشی کی حالت میں اینٹھ رہا تھا۔ دونوں لہولہان تھے۔ دونوں بے بسی کی تصویر تھے۔ ان دونوں کا قصور کیا تھا؟ وہ تو اپنے چھوٹے سے آشیانے میں، اپنی الگ دنیا بنائے ہوئے تھے، اور خاموشی سے جی رہے تھے۔ انہیں ان کے آشیانے سے کھینچنے والے اور دربدر بھٹکا کر زخم زخم کرنے والے یہی لالچی دنیادار تھے...... یہی گوری چمڑی والے۔ جن کے نزدیک اس خطے کے لوگ انسان کم اور جانور زیادہ ہیں۔ وہ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہیں اور ہر نامناسب سلوک ان سے عین مناسب سمجھتے ہیں۔ میرا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ جی چاہا، میرے ہاتھوں میں لوہے کے پنجے ہوں اور میں ان گوروں کی گوری چمڑیاں ادھیڑ کر رکھ دوں...... لیکن پھر پتا نہیں کیوں میرا دھیان سلویا کی طرف چلا گیا۔ میرے اندر کا ابال کم ہونے لگا۔ سلویا بھی تو گوری تھی۔ وہ کتنی مختلف تھی۔ کس قدر جدا تھی۔ مجھے والد صاحب کی کہی ہوئی ایک بات یاد آنے لگی وہ کہا کرتے تھے۔ برے سے برے لوگوں میں بھی اچھے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ کہیں یہ زیادہ ہوتے ہیں، کہیں کم اور کہیں بہت ہی کم...... لیکن یہی لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کسی قبیلے یا قوم کا وجود برقرار رہتا ہے۔

صابو کا چہرہ خون سے لتھڑ گیا تھا۔ اس کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کبھی کبھی ناقابلِ فہم آواز نکلتی تھی......

''اموں...... ناؤں...... اموں...... اموں......'' یہ اموں کون تھا؟ کون تھی؟ شاید یہ ماں

تھی۔ ہاں یہ ماں ہی تھی۔ ایسے موقعوں پر ماں کو ہی تو پکارا جاتا ہے۔

میں نے کن انکھیوں سے ڈی ایس پی اکرام شاہ کی طرف دیکھا۔ اکرام شاہ کے چہرے پر کرب کی باریک لکیریں سی تھیں...... یہ لکیریں صرف میں دیکھ سکتا تھا۔

بے ہوش ماں بیٹے کو اٹھا کر اندرونی کمروں میں پہنچایا گیا اور انہیں ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع ہو گئیں۔ زخمی پولیس اہلکاروں کی مرہم پٹی کے لیے بھی بھاگ دوڑ کی جانے لگی۔ صابو کو کورٹ میں پیش کیے جانے کا پروگرام اگلے روز تک ملتوی کر دیا گیا۔

رات کو میں نے دل کڑا کیا اور ایک بار پھر ڈی ایس پی سے بات کرنے کا پروگرام بنایا۔ میرے اور شوکت کے خیالات میں ذرہ بھر فرق نہیں تھا لیکن وہ ماتحت تھا...... وہ اپنے افسر سے اس انداز میں بات نہیں کر سکتا تھا جس انداز میں کل میں نے کی تھی۔ نو بجے تھے جب میں نے ایک بار پھر تھانے کا رخ کیا۔ ڈی ایس پی صاحب نے مستقل طور پر باغ پور میں ہی ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ سرگودھا اور لاہور کے دو تین انسپکٹر بھی باغ پور میں ہی تھے۔ اخباری نمائندے بھی منڈلا رہے تھے۔ میں تھانے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈی ایس پی صاحب شب بسری کے لیے حاجی الطاف کے گھر میں منتقل ہو گئے ہیں۔ میں حاجی الطاف کے گھر پہنچا۔ یہ گھر نوازش چاند کے گھر کے عین سامنے واقع تھا۔ وہاں رش لگا ہوا تھا۔ پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اخباری رپورٹر بھی موجود تھے۔ اندر پچھلے دو گھنٹے سے کوئی میٹنگ چل رہی تھی۔ پتا چلا کہ تحصیلدار اور نائب تحصیلدار وغیرہ بھی موجود ہیں۔

خدا خدا کر کے یہ میٹنگ ختم ہوئی۔ کافی لوگ چلے گئے۔ میں نے سنتری کے ہاتھ ڈی ایس پی صاحب کو چٹ بھیجی۔ میں نے لکھا تھا کہ آپ کے چند منٹ لینا چاہتا ہوں، ایک ضروری بات کرنا ہے۔ دس منٹ بعد سنتری نے آ کر کہا کہ صاحب کھانا کھا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر پیغام بھیجا اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہ ملا۔ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ تحصیلدار اور اس کے ہمنواؤں کا پلڑا ایک بار پھر بھاری ہو گیا ہے وہ لوگ اکرام شاہ صاحب کو دباؤ میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید صبح والے واقعے کے بعد اکرام شاہ کے رویے میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ اس واقعے میں چار پولیس والے زخمی ہوئے تھے۔

میں انتظار میں بیٹھا رہا۔ میرے کہنے پر سنتری نے ایک بار پھر میرا پیغام اندر پہنچایا۔ اس مرتبہ ڈی ایس پی صاحب خود ہی صحن میں نکل آئے۔ وہ شلوار قمیض میں تھے، موڈ خراب نظر آتا تھا۔ ”کیا بات ہے بھئی؟“ انہوں نے بہت رکھائی سے کہا۔

”سر، صابو کے بارے میں بات کرنا تھی۔ اس کی ماں کی طبیعت......“

”ماں کی طبیعت مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ میں ڈاکٹر ہوں۔“ ڈی ایس پی صاحب نے تلخی سے میری بات کاٹی۔

”میں کہنا چاہتا تھا کہ صابو......“

”دیکھو، اسلم! تم لوگ مجھے ڈکٹیٹ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میرا دماغ پولا ہو گیا ہے، یہ سب باتیں سن سن کر۔ میں کسی سے زیادتی نہیں کروں گا مگر میرے ساتھ بھی کوئی زیادتی نہ کرے۔ جاؤ، آرام کرو اور مجھے بھی کرنے دو۔“

میرا دماغ کھول گیا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ ڈٹ کر جواب دوں اور ڈی ایس پی صاحب کو بتاؤں کہ ایک سچے صحافی کی طاقت کیا ہوتی ہے لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میں ان پریشان کن حالات کو مزید پریشان کن کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو بے وقت ڈسٹرب کیا ہے، میں اپنی بات کل کسی وقت کر لوں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ اس پروگرام کو ختم ہی کر دیں تو بہتر ہے۔“ اکرام شاہ نے چڑچڑے پن سے کہا۔ ”مجھے میرا کام کرنے دیں اور آپ اپنا کام کریں۔“

انہوں نے رخ پھیرا اور پاؤں پٹختے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں خجل سا کھڑا رہ گیا۔ افسوس ہونے لگا کہ آیا ہی کیوں تھا۔

دروازے پر رائفل بردار سنتری نے بھی ڈی ایس پی کی بے رخی دیکھ لی تھی۔ وہ دروازے سے ہی ہانک لگا کر بولا۔ ”آجاؤ جناب! ہم نے دروازہ بند کرنا ہے۔“

میں واپس مڑا، عین اسی وقت میری نگاہ، گلی کے پار نوازش چاند کے گھر پر پڑی۔ دوسری منزل کے ایک دروازے میں سلویا کھڑی تھی۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ یقیناً اس نے میری اور ڈی ایس پی کی گفتگو کا منظر دیکھا تھا اور شاید ڈی ایس پی صاحب کے تلخ و ترش الفاظ

بھی سنے ہوں۔ وہ ایک دم برہم نظر آ رہی تھی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیچے اتری اور گلی پار کر کے حاجی الطاف کے صحن میں آ گئی، سنتری نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اسے ڈانٹتی ہوئی اندر گھس آئی۔ اس کا خوبرو چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ ”کہاں جا رہی ہو سلویا؟“ میں نے اس کا راستہ روکا۔

”پیچھے ہٹو، مجھے ان سے بات کرنے دو۔“ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولی۔ برآمدے میں رائفل بردار کانسٹیبلوں نے پھر اسے روک لیا۔ وہ انہیں ڈانٹتی اور دھکیلتی ہوئی اندر گھس گئی۔ اس کا انداز دلیرانہ تھا۔ انگریز کی حکومت ختم ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اکثر لوگ اب بھی انگریزوں سے مرعوب رہتے تھے۔ ایک عام انگریز بھی اعلیٰ مقامی افسر جتنی اہمیت رکھتا تھا۔

چند ہی لمحے بعد اندر سے تیز لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یقیناً ڈی ایس پی اور سلویا میں تند و تیز گفتگو ہو رہی تھی۔ مجھے الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے لیکن آہنگ سے پتا چلتا تھا کہ دونوں برہم ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے ڈی ایس پی کی آواز مدھم پڑ گئی مگر سلویا اسی تند لہجے میں بولتی رہی۔ یقیناً وہ پورے کرب کے ساتھ صابو اور اس کی ماں کا دکھ بیان کر رہی تھی۔

قریباً دس منٹ بعد ڈی ایس پی کے کمرے سے نکلی تو اس کی آنکھیں سرخ اور اشکبار تھیں۔ چہرہ ابھی تک اندرونی جذبات سے سرخ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سر جھکائے میرے قریب سے نکلی اور واپس چاند کے گھر میں چلی گئی۔ اس کی سچائی اور صاف گوئی کا میں پہلے بھی معترف تھا، آج اور معترف ہو گیا۔

اگلے روز حسبِ پروگرام ڈی ایس پی اکرام شاہ، صابو کو لے کر سرگودھا روانہ ہو گئے۔ روانگی کے وقت ماں جی بھی نوازش چاند کے گھر تھیں۔ انہیں صابو کی روانگی سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ ورنہ خدشہ تھا کہ کل والی صورت حال پھر پیدا ہو جائے گی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کوئی سو دفعہ پوچھ چکی تھیں کہ...... میرا صابو کہاں ہے۔ ہم نے انہیں تسلی دی تھی کہ اسے شہر لے جانے کا پروگرام ختم ہو گیا ہے۔ پولیس اسے باغ پور میں ہی رکھ کر دو چار دن بعد چھوڑ دے گی۔ اصل صورتِ حال کو اس دکھیاری عورت سے چھپایا گیا تھا

اور اصل صورتِ حال یہ تھی کہ تحصیلدار اور اس کے بااثر ساتھی صابو کو بری طرح پھنسانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ صابو پوری طرح ہوش مند ہے وہ اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا کے دم لیں گے۔

روانگی کے وقت صابو کے سر پر پٹیاں بندھی تھیں۔ اس کی آنکھیں بے تحاشا سوج گئی تھیں اور اس سوجن کے سبب اس کا چہرہ کچھ اور بھی بدہیئت ہو گیا تھا۔ اسے بڑی احتیاط سے بند گاڑی میں بٹھایا گیا تھا۔ کئی ہٹے کٹے اہلکار اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس اندیشے کے تحت کہ صابو گاڑی میں اودھم نہ مچائے اسے کوئی نشہ آور دوا پلا دی گئی تھی۔ وہ سویا سویا اور سُست نظر آ رہا تھا۔ ڈی ایس پی اکرام خود بھی گاڑی میں موجود تھے، میں نے ڈی ایس پی کا چہرہ دیکھا۔ وہ خاموش تھے اور آنکھوں میں ”سوچ“ کروٹیں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ ڈی ایس پی کا ذہن کیا سوچ رہا تھا اس بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔

باغ پور میں بے شمار لوگ یہاں وہاں گلیوں میں کھڑے تھے۔ گاؤں سے باہر جانے والے راستوں پر بھی لوگوں کا جم غفیر تھا۔ یہ سب لوگ صابو کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ صابو کے لیے لوگوں کا غم و غصہ بتدریج ختم ہو گیا تھا اور اس غم و غصے کی جگہ ایک طرح کی ہمدردی نے لے لی تھی۔ کل جو کچھ تھانے میں ہوا تھا اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں صابو اور اس کی والدہ کے لیے ہمدردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگوں کے چہرے دیکھ کر بتایا جا سکتا تھا کہ انہیں پولیس کی کارروائی سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ صابو کو اس طرح پابہ زنجیر شہر لے جایا جائے۔ ان کے غم و غصے کا رخ بہت حد تک انگریز شکاریوں کی طرف مڑ چکا تھا...... اور ان کے لیے لوگوں کی زبان سے سخت کلمات ادا ہو رہے تھے۔

سلویا کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کے کردار کی تعریف ہو رہی تھی اور صابو کے حوالے سے اس کے رویے کو سراہا جا رہا تھا۔ سلویا کی تعریفیں کرنے اور ان تعریفوں کو پھیلانے میں بابا صادق پیش پیش تھا۔ سلویا سے اسے عجیب طرح کا انس تھا۔

میں اس روز بے حد اداس تھا۔ یہ دہری اداسی تھی۔ ایک تو صابو کی گرفتاری اور اس

کی سرگودھا منتقلی کا دکھ تھا۔ دوسرے سلویا کی جدائی کا غم تھا۔ وہ ولایت واپس جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ جانے سے پہلے وہ اپنی کئی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کرنا چاہتی تھی۔ ان میں سے ایک خواہش یہ تھی کہ وہ میرا گھر دیکھنا چاہتی تھی۔ میری بہن ثریا اور میرے والدین سے ملنا چاہتی تھی۔ ایک دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ مجھے میرے دفتر میں ٹیبل پر کام کرتے دیکھنا چاہتی تھی کہ پاکستان میں اخبار کس طرح پرنٹنگ کے مرحلے طے کرتا ہے...... لیکن بہت سی دوسری خواہشوں کی طرح اسے ان خواہشوں کا گلا بھی گھونٹنا تھا۔ اس کے پاس واپسی کے لیے ٹائم بہت کم تھا۔

یہ تیسرے روز سہ پہر کی بات ہے۔ میں نوازش چاند کے گھر میں موجود تھا۔ ''ماں جی'' کو پولیس اہلکار کل رات ہی سرگودھا لے گئے تھے۔ انہیں یہاں روکنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف صابو کو بھی ''ماں جی'' کے بغیر قابو رکھنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ ''ماں جی'' کی کچھ چیزیں یہاں چاند کے گھر میں رہ گئی تھیں۔ سرگودھا سے شوکت کا پیغام آیا تھا کہ میں اے ایس آئی نیاز کے ہاتھوں یہ اشیا سرگودھا پہنچا دوں۔ میں یہ اشیا لینے ہی آیا تھا۔ دل کے کسی گوشے میں شاید یہ خواہش موجود ہو کہ سلویا کو ایک بار اور دیکھ لوں۔ وہ ابھی تک چاند کے گھر میں اس کے بیوی بچوں کے ساتھ موجود تھی۔

میں اندرونی کمرے میں چاند سے باتیں کر رہا تھا۔ سلویا باہر صحن کے ایک گوشے میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے لمبے شہد رنگ بال کھول رکھے تھے۔ وہ چاند کی بیوی سے دیسی انداز میں دیسی گھی کی مالش کروا رہی تھی۔

میں چاند سے باتوں میں مشغول تھا جب اندازہ ہوا کہ کوئی بیرونی دروازے پر آیا ہے۔ باتوں کی بھی آواز بھی سنائی دی۔ پھر میں نے تیز قدموں کی آہٹ سنی۔ یہ سلویا تھی۔ وہ جلدی سے اندر آئی۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی خوشی سے چمک رہا تھا۔ ''ایک بڑی اچھی خبر ہے۔'' وہ میرے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔

''کیا خبر ہے؟''

''صابو پولیس کی حراست سے نکل گیا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ابھی حوالدار فدا حسین خود بتا کر گیا ہے۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے کہا ہے کہ صابو کو کورٹ میں پیش کرنے کے بعد واپس تھانے لے جایا جا رہا تھا۔ اس کی والدہ بھی گاڑی میں تھی۔ مضافاتی تھانے کی طرف جاتے ہوئے گاڑی ویران راستے پر پہنچی تو اسٹیشن ویگن میں سوار چند نقاب پوش ڈاکوؤں نے اچانک گاڑی کو گھیر لیا۔ حملہ اتنا اچانک تھا کہ پولیس والے کچھ بھی نہ کر سکے۔ ڈاکوؤں کے پاس جدید ہتھیار تھے۔ ان کی فائرنگ سے دو پولیس والے زخمی ہوئے۔ ڈاکو، صابو اور اس کی ماں کو چھڑا کر فرار ہو گئے ہیں۔''

میں نے شدید حیرت کے عالم میں یہ خبر سنی۔ کچھ یہی کیفیت چاند کی بھی ہوئی۔ ہم اس خبر کی تصدیق کے لیے باہر نکل آئے...... باغ پور کے تھانے میں بھی یہی خبر چکرا رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد اس وقت اس خبر کی مکمل تصدیق ہو گئی جب باغ پور تھانے کے دو ہیڈ کانسٹیبل سرگودھا سے باغ پور واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ آج ایک بجے کے قریب چند نامعلوم لوگ صابو اور اس کی والدہ کو پولیس کی حراست سے چھڑا کر لے گئے ہیں۔

اس خبر میں اطمینان کا پہلو تھا تو تشویش کا پہلو بھی تھا۔ یہ بات سوچی جا سکتی تھی کہ صابو کو ختم کرنے کے لیے جان بوجھ کر پولیس کی حراست سے بھگایا گیا ہے۔ کچھ بااثر لوگ صابو کو خطرناک قاتل قرار دے رہے تھے۔ اسے ''پکڑنے'' کی کوشش میں مارا جا سکتا تھا۔ صابو کے مرنے سے انگریزوں پر قانون شکنی کا رخ کم ہو سکتا تھا۔

اصل صورت حال کا پتا شوکت سے لگ سکتا تھا مگر شوکت ڈی ایس پی کے ساتھ سرگودھا میں تھا۔ پتا نہیں، وہ کہاں الجھا ہوا تھا، اس کا کچھ کھوج نہیں مل رہا تھا۔ صابو کے نکل بھاگنے کی خبر پر عام لوگ اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ بہت تھوڑے ایسے تھے جنہیں یہ تشویش تھی کہ صابو پھر کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ درحقیقت لوگ اس ساری صورت حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ صابو نے جو کچھ کیا اس میں اس کا اپنا قصور بہت کم تھا۔

میں اور سلویا باغ پور میں تھے۔ میں شدت سے شوکت کا انتظار کر رہا تھا۔ چوتھے روز اس کی صورت نظر آئی۔ وہ کافی تھکا ہوا لگتا تھا۔ جب ہمیں تنہائی ملی تو میں نے اس سے پہلا سوال یہی پوچھا کہ کہیں صابو کو ''پولیس کارروائی'' میں مار تو نہیں دیا جائے گا۔

شوکت نے اطمینان سے کہا۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔''

''تم اتنے یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟''

شوکت نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ ایک گہری سانس لے کر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ...... صابو کے چھوٹ جانے میں ڈی ایس پی اکرام شاہ کا ہاتھ ہے۔''

یہ ایک دھماکا خیز اطلاع تھی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

شوکت زیرلب مسکرایا۔ ''اکرام شاہ صاحب اچھے آدمی ہیں۔ مجھے چار پانچ روز سے لگ رہا تھا کہ وہ صابو اور اس کی ماں کے لیے کچھ نہ کچھ کریں گے۔ خاص طور سے کمپاؤنڈر رحمت والا معاملہ صاف ہونے کے بعد...... جس دن یہ کلیئر ہوگیا تھا کہ رحمت کو صابو نے نہیں مارا، اکرام شاہ صاحب کے رویے میں تبدیلی آگئی تھی۔''

''میرا بھی خیال یہی ہے...... لیکن...... تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اکرام صاحب نے ہی صابو کو بھگایا ہے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اور دو پولیس والے زخمی بھی ہوئے ہیں......''

''یار تم خود صحافی ہو۔ تمہیں پتا ہے پولیس میں سب کچھ چلتا ہے۔ میرے پاس اپنے دعوے کا کوئی ثبوت تو نہیں ہے لیکن ننانوے فی صد یقین ہے کہ بات وہی ہے جو میں نے تمہیں بتائی ہے...... تم دیکھ لینا، صابو پکڑا جائے گا اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکا ہے؟''

''بالکل۔'' شوکت نے سر ہلایا۔ اس کے بعد کرسی پر نیچے کو کھسک کر اس نے پشت سے ٹیک لگائی۔ اپنے پاؤں انگیٹھی کی طرف کیے اور لمبی جماہی لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

حوالدار فدا حسین اندر داخل ہوا۔ ''مونگ پھلی لاؤں جناب؟''

''آہو۔ لے آ بھئی۔ آج تو تیری آواز بھی مونگ پھلی کی طرح کڑاکے دار ہے۔''

حوالدار جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا اب ہم جن بھوت اور تعویذ گنڈوں کے خلاف کوئی بات شروع کر دیں گے اور وہ اس طرح کی ''گمراہ کن'' باتیں سننا نہیں چاہتا تھا۔

☆=====☆=====☆

سلویا کے حوالے سے میرے دل میں امید کی کرن موجود تھی...... مگر اس نے وہی کیا

جو اس نے کہا تھا۔ وہ واپس جانا چاہتی تھی، ہر صورت واپس جانا چاہتی تھی۔ ایک ابرآلود شام کو وہ بڑی خاموشی کے ساتھ لاہور روانہ ہوگئی۔ وہاں دو تین روز میں پولیس حکام نے اسے کلیئر کر دیا۔ اس کے کاغذات پہلے ہی مکمل تھے...... وہ لندن روانہ ہوگئی...... اس سے میری آخری ملاقات لاہور ائیر پورٹ پر ہی ہوئی تھی۔ ''میں تمہیں یاد رکھوں گی۔ تم بھی مجھے یاد رکھنا۔'' اس نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے دل پر پتھر رکھ کر جواب دیا۔

وہ بے اختیار میرے گلے سے لگ گئی۔ اس نے میرا رخسار چوما تھا اور پھر کہے سنے بغیر تیزی سے ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چلی گئی تھی۔

وہ چلی گئی تھی...... لیکن مجھے لگتا تھا کہ سب کچھ ختم نہیں ہوا...... کچھ نہ کچھ باقی ہے۔ کوئی باریک سی ڈور ہے جو ہمارے درمیان اب بھی موجود ہے۔ کوئی کچا دھاگا سا...... جو نظر نہیں آتا لیکن موجود ہے اور موجود رہے گا۔

وقت گزرتا رہا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اندیشے باطل ثابت ہوتے گئے اور شوکت کے قیافے درست ثابت ہو گئے...... صابو پھر پکڑا نہیں گیا۔ پولیس رسمی طور پر ''ماں بیٹا'' کو تلاش کرتی رہی، پھر یہ رسمی کارروائی بھی معدوم ہوگئی...... ایک ماں اپنے پروں میں اپنے چوزے کو چھپا کر نہ جانے کس گھونسلے میں جا بیٹھی تھی۔

مجھے اور شوکت کو یقین تھا کہ صابو جہاں بھی ہوگا محفوظ ہوگا۔ اس کی سلامتی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خود نہیں سوچتا تھا۔ اس کے لیے اس کی ماں سوچتی تھی...... اور ماں سے بہتر بھلا کون سوچ سکتا ہے۔

جیکب اور ہارڈی پر پاکستان میں کیس چلنا چاہیے تھا۔ باغ پور کے اردگرد ہونے والی ہلاکتوں میں ان خبیثوں کا کردار بہت اہم تھا۔ خاص طور سے رازی جان کے قتل میں...... انہوں نے رازی جان کو چند سو روپے دے کر دانستہ موت کے منہ میں جھونکا تھا۔ ان جرائم کے علاوہ انہوں نے کئی روز تک صابو کی والدہ کو حبسِ بے جا میں رکھا تھا اور اذیتیں پہنچائی تھیں۔ پھر کھوہ والی میں ہونے والے پولیس مقابلے میں بھی یہ لوگ ملوث

تھے۔ اس مقابلے میں اے ایس آئی نذیر ہلاک ہوا تھا لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ انگریز حاکم علاقے سے نیا نیا گیا تھا۔ اس کا رعب داب ابھی تک برقرار تھا۔ انتظامیہ کوئی ایسا مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتی تھی جس کی وجہ سے انہیں بعد میں شرمندگی اٹھانا پڑے۔ دو تین ماہ بعد ان لوگوں کو انٹرپول کے ذریعے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔

چوہدری ارباب کو اس کے کیے کی سزا اس کے جوان بیٹے کی موت کی صورت میں مل چکی تھی۔ چوہدری کا اپنا کیس بھی زیرِ سماعت تھا۔ اس کی زمین بک رہی تھی اور روپیا پانی کی طرح خرچ ہو رہا تھا...... وہ ہر رات جوان جسموں سے کھیلنے والا عیاش چوہدری تھا۔ اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جیل میں اس کا وقت بڑی اذیت سے کٹ رہا تھا۔ (بعد میں اسے ڈھائی سال قید با مشقت بھگتنا پڑی۔ جس نے اسے دن میں تارے دکھا دیے)

اس کہانی کے دو اہم کردار زبیدہ اور صلو بھی تھے۔ کبھی انہوں نے ایک دوسرے سے پیار کیا تھا، لیکن اب ان کی علیحدہ علیحدہ زندگی تھی۔ زبیدہ کی محبتیں اپنے بن باپ کے بچے کے لیے تھیں۔ صلو کی شادی مقتولہ صغراں کی بہن سے طے کر دی گئی۔ وہ شکل صورت میں کافی حد تک صلو کی ہم پلہ تھی۔ پرانے تعلق کی وجہ سے زبیدہ اور صلو اس کیس میں پھنس گئے تھے لیکن طویل تفتیش کے باوجود وہ بے گناہ ثابت ہوئے۔ انہیں کلیئر کر دیا گیا۔

اے ایس آئی نذیر اور کمپاؤنڈر رحمت کی اموات بھی اس روئداد میں اہم تھیں۔ اے ایس آئی نذیر کی موت کا صدمہ شوکت کو بہت دیر تک رہا۔ وہ شوکت کا ماتحت ہی نہیں اس کا دوست اور دستِ راست بھی تھا۔ اس طرح کمپاؤنڈر رحمت کی ناگہانی موت کو بھی لوگ تادیر نہیں بھولے۔

ان واقعات کے قریباً دس ماہ بعد کی بات ہے۔ لاہور کی ایک تقریب میں ڈی ایس پی اکرام شاہ سے میری اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ میں اس تقریب میں اپنے اخبار کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے موجود تھا۔ اکرام شاہ نے مجھے اور میں نے اکرام شاہ کو پہچان لیا۔ وہ میرے پاس آئے۔ علیک سلیک کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ شوکت کے بارے میں پوچھا کہ آج کل کہاں ہے۔ پھر انہوں نے ایک پرانی بات یاد دلائی۔ اسی رات کا ذکر کیا

جب میں حاجی الطاف کے گھران سے ملنے گیا تھا۔ اکرام صاحب نے نہ صرف میری بات نہیں سنی تھی بلکہ مجھ سے تلخ لہجے میں بات کی تھی۔ انہوں نے میرے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''میں اس رات کے واقعے کے لیے آپ سے شرمندہ ہوں اسلم صاحب۔ دراصل اس وقت میں بے حد پریشان تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میرا خیال ہے کہ اس رات میرا ذہن بنانے میں آپ کا اور مس سلویا کا بہت کردار ہے۔ خاص طور سے مس سلویا نے مجھ سے بڑے زوردار طریقے سے بات کی اور میرے لیے ایک راستہ منتخب کرنے میں آسانی پیدا کی۔''

''راستہ منتخب کرنے'' کے الفاظ اکرام صاحب نے عجیب معنی خیز لہجے میں کہے۔ میں چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور معنویت تھی۔ ان لمحوں میں مجھے لگا کہ میں نے ان کی آنکھوں میں سب کچھ پڑھ لیا ہے۔ وہ آنکھیں بہ زبانِ خاموشی کہہ رہی تھیں۔ ''میں نے وہی کچھ کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا...... جو تم سب لوگ چاہتے تھے۔''

آخر میں سلویا کا ذکر...... کیونکہ سلویا کے ذکر کے بغیر یہ کہانی ادھوری رہے گی۔ سلویا ان واقعات کے بعد قریباً پینتالیس برس تک زندہ رہنے کے بعد ستر سال کی عمر میں چار پانچ سال قبل فوت ہوئی ہے۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے گا کہ اس نے اپنی زندگی کیسے گزاری اور کہاں گزاری؟

اس نے یہ زندگی پاکستان میں گزاری اور ''ایک ایسے شخص'' کے ساتھ گزاری جس سے وہ بہت پیار کرتی تھی۔

جی ہاں...... سلویا کے ولایت چلے جانے کے، دو سال بعد کی بات ہے۔ وہ مارچ کی ایک بڑی سہانی اور چمکیلی سہ پہر تھی میں دفتر میں اپنی میز پر بیٹھا لکھ رہا تھا۔ میرے دائیں طرف کی کھڑکی سے پھولوں کی خوشبو اور بہار کے جھونکے ایک ساتھ میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے لیکن میں اس بہار سے بے خبر تھا جو بائیں طرف سے میرے کمرے میں اور میری اداس زندگی میں داخل ہوئی تھی...... اس بہار کا نام سلویا تھا...... وہ کندھے سے سفری بیگ لٹکائے ادھ کھلے دروازے میں کھڑی تھی اور یک ٹک مجھے کام کرتے ہوئے

دیکھ رہی تھی، اچانک میری نگاہ اس کی طرف اٹھی اور اٹھی رہ گئی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس طرح اچانک اسے اپنے سامنے دیکھوں گا۔

وہ کیسے چلی آئی ہے؟ وہ کیسے چلی آئی ہے؟ میرے ذہن نے پکار کر سوال کیا۔

ذہن کے اندر سے ہی جواب آیا...... شاید یہ وہی کچا دھاگا ہے جو دو جدا ہونے والوں کے درمیان باقی رہتا ہے اور پھر مضبوط ہوتے ہوتے ایک دن ناقابلِ شکست ڈور بن جاتا ہے۔

میری اور سلویا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ میں نے اس شادی میں باغ پور سے خاص طور پر بابے صادق کو بلایا تھا۔ بابا صادق وہاں کے کھیتوں کی ساری خوشبو اور وہاں کے گلی کوچوں کی ساری خوبصورتی اپنے ساتھ لایا...... اپنی دلچسپ باتوں اور قصوں سے اس نے شادی کی تقریب کو کشتِ زعفران بنائے رکھا۔ شادی سے پہلے سلویا نے اسلام قبول کیا اور اس کا نام سیما رکھا گیا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، میں اسے سیما اور سلویا دونوں ناموں سے پکارتا رہا۔ شادی کے روز میں نے سلویا سے پوچھا تھا۔

''تم دو سال تک مجھ سے دور رہیں۔ تم نے صرف ایک خط کے سوا مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ پھر دو سال بعد تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے یہاں چلی آئیں۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔''

''ہاں مجھے پتا تھا۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''جب میں نے شادی نہیں کی تھی اور میں تمہیں دن رات یاد کرتی تھی تو پھر یقینی بات تھی کہ تم بھی ایسا ہی کرتے ہوگے۔''

اس کا جواب ایسا سادہ اور منطقی تھا کہ اس کے بعد میں نے اور سوال نہیں پوچھا۔

سلویا ایک اچھی بیوی اور بہت اچھی ماں ثابت ہوئی۔ ہمارے آنگن میں چار پھول کھلے۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ ہمارے بچوں نے اچھی تعلیم حاصل کی اور انہیں اچھا انسان بنانے کی ہم نے بھرپور کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنی کوششوں میں کامیاب رہے۔

گزرنے والے ماہ وسال میں اکثر جب ہم تنہا ہوتے تھے تو باغ پور کے خونی واقعات کو یاد کرتے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے ہمارے ذہنوں میں خود بخود صابو اور اس کی ماں کے چہرے گھوم جاتے تھے...... ہمیں وہ ناقابلِ فراموش جذبہ یاد آتا تھا جو ہم نے

''ماں جی'' کے سینے میں موجزن دیکھا تھا۔

یہ جذبہ مجھے آج بھی یاد آتا ہے اور واقعی خدا کا انعام کیا ہوا یہ جذبہ جسے ہم ''ممتا'' کہتے ہیں انمول ہے۔ یہ جذبہ صابو جیسے کریہہ صورت بچے کو بھی سینے سے لگاتا ہے۔ اس کا منہ چومتا ہے، اس کو اپنا سوہنا پتر کہہ کر اس کی بے لوث پرورش کرتا ہے اور پھر اس کی حفاظت کے لیے اس کے سامنے اپنی بوڑھی ہڈیوں کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے...... دنیا کا ہر ستم اسی دیوار سے ٹکرا کر بکھرتا رہا ہے اور بکھرتا رہے گا۔

آخر میں کچھ ذکر انسان کے عقیدے کا...... عقیدہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ غلط ہو یا صحیح ایک بار بن جائے تو پھر اس کا مٹنا مشکل ہوتا ہے۔ باغ پور کے گردونواح میں حوالدار فدا حسین جیسے بہت سے لوگ ہیں جو پچاس برس گزر جانے کے بعد آج بھی یہ کہتے ہیں کہ صابو انسان نہیں تھا۔ وہ انسان کے روپ میں جن تھا۔ وہ اس لیے باغ پور پر آفت بن کر نازل ہوا کہ لوگوں نے سچے سائیں کے مزار پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کو سزا دینے کے بعد صابو اور اس کی ماں (جو جن زادی تھی) دونوں اوجھل ہوگئے۔ وہ ڈھونڈنے سے نہیں ملے وہ مل ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ انسان نہیں تھے...... ایسی باتوں پر...... ''سر پکڑ کر'' بیٹھنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

☆====== ختم شد ======☆